OUP—391—29-4-72—10,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۹۵ ح ۵.۳۰ Accession No. U 1355

Author حسن ۔ خواجہ
حسن نظامی

Title دہلی کا آخری سانس

This book should be returned on or before the date last marked below.

اکتوبر [illegible]۱۹ء میں پانچویں بار یہی کتاب

"بہادر شاہ کا روزنامچہ" کے نام سے شائع ہوئی

دہلی
کا
آخری سانس

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے

غدر سے پہلے کے احسن الاخبار بمبئی کے فارسی مضامین سے بذریعہ ترجمہ تیار کیا

اور

اگست سنہ ۱۹۲۵ء میں پہلی بار

ابن عربی کارکن حلقہ مشائخ دہلی نے

دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

بار اول

قیمت عہ

۷۸۶ — ھو الکل — یا معین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دہلی کا آخری سانس

غدر ۱۸۵۷ء کے وہ حالات جو دہلی شہر اور تیموریہ خاندان کے آخری بادشاہ اور ان کی بیگمات اور شہزادوں اور دہلی کے عام باشندوں اور اس وقت کے انگریزوں کو پیش آئے۔ میں نے آٹھ حصوں میں قلم بند کر کے شائع کر دیے ہیں۔

پہلے حصہ کا نام بیگمات کے آنسو، دوسرے کا انگریزوں کی بپتا تیسرے کا محاصرہ دہلی۔ چوتھے کا بہادر شاہ کا مقدمہ، پانچویں کا گرفتار شدہ خطوط، چھٹے کا غدر کے اخبار، ساتویں کا غالب کا روزنامچہ، آٹھویں کا دہلی کی جانکنی ہے۔

یہ آٹھوں حصے کئی کئی بار چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اور تمام ہندوستان کی اقوام انکو بہت شوق اور توجہ سے پڑھتی ہیں۔ اور ان میں سے کئی کتابوں کے ہندی اور گجراتی اور انگریزی ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔

اب اتفاق سے مجکو اسی سلسلہ کی ایک ایسی چیز ملی ہے جو آجتک کسی کتاب میں موجود نہ تھی۔ اور اردو زبان اس عجیب تاریخی ذخیرہ سے محروم تھی۔ اور جس کے مطالعہ سے علاوہ اس کے کہ دہلی کے اور بہادر شاہ بادشاہ کے بہت سے خانگی حالات معلوم ہونگے یہ بھی ثابت

ہو گا کہ غدر ۱۸۵۷ء سے چند سال پہلے دہلی اور تیموری سلطنت کا آخری سانس کس قدر حسرت ناک تھا۔ اور اس منظر سے ہندوستانی دل پر کیسا اثر ہوتا ہے +

۱۸۴۴ء اور ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۶ء میں شائع شدہ احسن الاخبار بمبئی کا ایک فائل نواب عابد یار جنگ بہادر مرحوم ساکن حیدر آباد دکن سے مجکو حاصل ہوا۔ جو فارسی زبان میں ہے۔ اور جس میں اور شہروں کی خبروں کے علاوہ دہلی کی خبریں بھی بکثرت ہیں +

دہلی کی خبروں میں زیادہ حصہ تیموریہ خاندان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ کے حالات خانگی کا ہے۔ جن کے پڑھنے سے بے شمار نامعلوم چیزیں تاریخ کی روشنی میں آتی ہیں +

اور جزئیات کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لیکر بڑی بڑی اہم نامعلوم تاریخی چیزیں اس کے اندر موجود ہیں +

جب میں نے اس فائل کو پڑھا تو فوراً فارسی سے اُردو ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ غدر دہلی کے سلسلہ میں ایسی کتاب کا ہونا بہت ضروری تھا جس سے غدر ۱۸۵۷ء سے دس گیارہ سال پہلے کے واقعات کا علم ناظرین کو ہو جائے +

یہ حالات غدر سے دس گیارہ سال پہلے کے ہیں۔ جب کسی کو غدر کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اگرچہ آثار رنجش کے پیدا ہو گئے تھے۔ احسن الاخبار کی زبان فارسی اور خط شکستہ اور کاغذ نہایت بوسیدہ اور کمزور ہے۔ اس لیے بہت احتیاط کے ساتھ جناب مولانا سید محمد صاحب ناصر دہلوی نے اسکا اُردو ترجمہ کیا۔ اور نیز جگہ جگہ بریکٹ (قوسین) میں اپنے حاشیے بھی مختصر الفاظ میں لکھدیے تاکہ مطالب کی تشریح ہو جائے +

ترجمہ میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کی گئی۔ اصل عبارت کا پورا لفظی مفہوم لکھدیا گیا۔ البتہ لمبے چوڑے القاب آداب کو بطور نمونہ کے چند جگہ لکھکر باقی مقامات پر بخوف طوالت چھوڑ دیا گیا۔

کتاب ہذا کا مضمون اپنا تعارف خود آپ ہی کرا دے گا مجھے طول طویل تمہید کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

میں نے اس کتاب کا نام **دہلی کا آخری سانس** ایک ناقابل بیان اثر سے متاثر ہو کر بے ساختہ رکھدیا ہے جب میں ترجمہ کے وقت اس کے مضامین پڑھتا تھا دہلی کے گزرے ہوئے زمانہ کی کیفیات مجھ پر اس قدر غلبہ کرتی تھیں کہ میں بے اختیار کہتا تھا۔

دیکھو میری مرنے والی دہلی نے سکرات موت کے وقت
کیونکر آخری سانس لیا اور دنیا سے چل بسی۔

یقیناً جو لوگ اس کتاب کا مطالعہ کرینگے ان پر بھی یہی کیفیت طاری ہوگی اور اور وہ بھی زمانہ کے انقلابات کو تصور میں لا کر متحیر ہو ہو جائیں گے۔

راقم **حسن نظامی** درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

دہلی۔ ۳ مئی ۱۹۲۵ء

خیال، میں تمہارے بزرگوں سے کچھ خطائیں سرزد ہوئی ہیں جن میں سب سے بڑی یہ ہے کہ عاشق و معشوق کے درمیان حجاب ڈالا گیا۔ یعنی حضرت محبوب الٰہی اور حضرت امیر خسرو کے مزارات کے بیچ میں محمد شاہ بادشاہ کو دفن کیا گیا۔ حضرت محبوب الٰہی اور حضرت امیر خسرو کے مابین جو محبت تھی اس کا تقاضہ تھا کہ ان دونوں حضرات کے مزارات کے درمیان کوئی حجاب نہ کیا جاتا۔ کیونکہ حضرت محبوب الٰہی فرمایا کرتے تھے۔ کہ اگر شریعت کا قدم درمیان نہ ہوتا تو ہم اور خسرو ایک قبر میں رہتے۔ ایسی صورت میں محمد شاہ کو بیچ میں دفن کرنا بہت بُرا ہوا اور تباہی سلطنت پر پڑی۔

عرس کا جلوس

بہادر شاہ جب حضرت محبوب الٰہیؒ کے عرس شریف میں حاضر ہوتے تو بڑی کیفیت ہوتی تھی جب تک بادشاہ نہ آجاتے ختم رُکا رہتا۔ جونہی اُن کی سواری آتی غل مچ جاتا کہ بادشاہ آئے۔ خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہوتے تھے مگر بادشاہ کے درگاہ میں داخل ہوتے ہی لوگ راستہ چھوڑ دیتے اور دروازے سے مزار مبارک تک ایک آدمی کے چلنے کے قابل راستہ بنجاتا تھا جس میں سے گزر کر بادشاہ پہلے مزار مبارک پر حاضر ہوتے اس کے بعد محفل میں آجاتے بادشاہ کے آتے ہی ختم شروع کردیا جاتا اور ختم کے بعد قوالی شروع ہوتی۔ بادشاہ ایک غزل سُنتے اس کے بعد محفل سے چلے جاتے۔ محفل سے اُٹھتے وقت ایک عجیب بہار ہوتی تھی۔ کہ جونہی بادشاہ نے چلنے کا رُخ کیا فوراً تمام میلہ کائی کی طرح سے پھٹ گیا اور دروازے تک راستہ بن گیا۔

شاہی گدائی اور بربادی کا زمانہ

بہادر شاہ اگر غدر کی بلا میں مبتلا نہ ہوتے تو انکی درویشی بڑے لطف و اطمینان سے بسر ہوتی۔ مگر بیچارے ناکردہ گناہ باغی لشکر کے وبال میں پھنس گئے اور عمر کا آخری حصہ ہزاروں مصائب میں گزرا۔

میری والدہ ماجدہ بروایت اپنے پدر بزرگوار حضرت شاہ غلام حسن صاحب بیان فرماتی تھیں کہ جس دن بہادر شاہ دہلی کے قلعے سے نکلے تو سیدھے درگاہ حضرت محبوب الٰہی صاحب میں حاضر ہوئے۔ اُس وقت بادشاہ پر عجیب مایوسی اور ہراس کا عالم تھا۔ چند مخصوص خواجہ سراؤں اور ہوادار کے کہاروں کے سوا کوئی آدمی ہمراہ نہ تھا۔ فکر و اندیشہ سے بادشاہ کا چہرہ اترا ہوا تھا اور گرد وغبار سفید ڈاڑھی پر جما ہوا تھا۔ بادشاہ کی آمد سُنکر نانا صاحب درگاہ شریف میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ مزار مبارک کے سرہانے در سے تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی حسب معمول بشرہ کو متبسم کر دیا۔ میں سامنے بیٹھ گیا۔ اور خیریت دریافت کرنے لگا جسکے جواب میں نہایت طمانیت سے بولے میں نے تم سے پہلے ہی کہدیا تھا کہ یہ کم بخت باغی سپاہی خود سر ہیں۔ انپر اعتماد کرنا غلطی ہے۔ خود بھی ڈوبیں گے مجکو بھی ڈبوئیں گے۔ آخر وہی ہوا کہ بھاگ نکلے۔ بھائی اگرچہ میں ایک گوشہ نشین فقیر ہوں مگر ہوں اُس خون کی یادگار جس میں آخر دم تک مقابلہ کرنے کی حرارت ہوتی ہے میرے باپ داداؤں پر اس سے زیادہ آڑے وقت پڑے ہیں اور اُنھوں نے ہمت نہیں ہاری مگر مجھے تو غیب سے انجام دکھا دیا گیا ہے۔ اب اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ میں تخت ہند پر تیمور کی آخری نشانی ہوں۔ مغلی حکومت کا چراغ دم توڑ رہا ہے اور کوئی گھڑی کا مہمان ہے۔ پھر جان بوجھ کر خواہ مخواہ

کیوں خونریزی کراؤں۔ اس واسطے قلعہ چھوڑکر چلا آیا۔ ملک خدا کا ہے جسکو چاہے دے۔ سینکڑوں برس ہماری نسل نے سرزمین ہند میں ہیبت و جبروت سے سکہ چلایا اب دوسروں کا وقت ہے حکمرانی کریں گے، تاجدار کہلائیں گے اور ہم ان کے مفتوح ٹھہریں گے۔ یہ کوئی رنج و افسوس کی بات نہیں آخر ہم نے بھی تو دوسروں کو مٹا کر اپنا گھر بسایا تھا۔

ان حسرت ناک باتوں کے بعد بادشاہ نے ایک صندوقچہ دیا اور کہا لو یہ تمہارے سپرد ہے۔ امیر تیمور نے جب قسطنطنیہ کو فتح کیا تھا تو سلطان یلدرم بایزید کے خزانے سے یہ نعمت ہاتھ لگی تھی۔ اس میں حضور سرور کائنات کی ریش مبارک کے پانچ بال ہیں، جو اجتک ہمارے خاندان میں بحیثیت تبرک خاص چلے آتے ہیں اب میرے لیے زمین و آسمان میں کہیں ٹھکانا نہیں، ان کو لیکر کہاں جاؤں۔ آپ سے بڑھکر کوئی اسکا اہل نہیں ہے۔ لیجیے ان کو رکھئے یہ میرے دل و دیدہ کی ٹھنڈک ہیں جن کو آج کے دن کی ہولناک مصیبت میں اپنے سے جدا کرتا ہوں۔ چنانچہ نانا صاحب نے وہ صندوقچہ لے لیا اور درگاہ شریف کے توشہ خانہ میں داخل کردیا جو اب تک موجود ہے اور ان تبرکات کی ہر سال ربیع الاول کے مہینہ میں زیارت کرائی جاتی ہے۔

نانا صاحب سے بادشاہ نے کہا کہ آج تین وقت سے کھانے کی مہلت نہیں ملی۔ اگر گھر میں کچھ تیار ہو تو لاؤ۔ نانا صاحب نے کہا ہم لوگ بھی موت کے کنارے کھڑے ہیں کھانے پکانے کا ہوش نہیں گھر جاتا ہوں جو کچھ موجود ہے حاضر کرتا ہوں، بلکہ آپ خود گھر تشریف لے چلیں جب تک میں زندہ ہوں اور میرے بچے سلامت ہیں آپ کو کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ پہلے ہم مر جائیں گے اس کے بعد کوئی اور وقت آسکے گا۔ بادشاہ نے فرمایا۔ آپ کا احسان

جو ایسا کہتے ہو، مگر اِس بوڑھے جسم کی حفاظت کے لئے اپنے پیروں کی اولاد کو قتل گاہ میں بھیجنا مجھے کبھی گوارا نہ ہوگا۔ زیارت کرچکا، امانت سونپ دی اب دو لقمے محبوبی لنگر سے کھاؤں تو مقبرۂ ہمایوں میں چلا جاؤں گا وہاں جو قسمت میں لکھا ہے پورا ہو جائیگا۔

نانا صاحب گھر آئے دریافت کیا کہ کچھ کھانے کو موجود ہے کہا گیا کہ بیسنی روٹی اور سرکہ کی چٹنی ہے۔ چنانچہ وہی ایک خوان میں آراستہ کرکے لے آئے اور بادشاہ نے دو چنے کی روٹی کھاکر تین وقت کے بعد پانی پیا اور خدا کا شکرانہ بھیجا اس کے بعد ہمایوں کے مقبرے میں جاکر گرفتار ہوئے اور رنگون بھیجدیئے گئے۔ رنگون میں بھی بادشاہ کی درویشانہ معاشرت میں فرق نہ آیا۔ جب تک زندہ رہے ایک صابرو متوکل درویش کی طرح بسراوقات کرتے رہے۔

یہ وہ قصّہ ہے کہ جس میں عقلمند آدمی کے لئے عبرت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور جس کے سُننے سے انسان اپنے غرور وتکبّر کو بھول جاتا ہے اور جب دماغ سے تکبّر کی بُو جاتی رہتی ہے۔ تو آدمی اصل آدمی بن جاتا ہے۔

دوسرا افسانہ

شہزادے کا بازار میں گھسٹنا

یہ دہلی جس کو ہندوستان کا دل اور حکومت کا تخت گاہ کہتے ہیں جب آباد تھی اور لال قلعہ میں مغلوں کی آخری شمع ٹمٹما رہی تھی آفت اور بلا میں

مبتلا ہونے کو ہوئی تو پہلے اس کے باشندوں کے عمل میں فرق آیا اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ پہلے حاکموں کے اعمال خراب ہوئے اسکی رعیت بھی بداعمالیوں میں پڑ گئی نتیجہ یہ ہوا کہ راجا پرجا دونوں برباد ہوگئے۔ مثالیں ہزاروں ہیں مگر ذیل میں ایک نہایت عبرت ناک کہانی سُنا کر میں باشندگانِ ہند کو عموماً اور مسلمانوں اور صوفیوں کو خصوصاً خدا کے خوف سے ڈراتا ہوں۔

(۱)

غدر سے ایک برس پہلے دہلی سے باہر جنگل میں چند شہزادے شکار کھیلتے پھرتے تھے اور بے پرواہی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں فاختاؤں کو جو دوپہر کی دھوپ سے بچنے کے لئے درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں پر خدا کی یاد کی تسبیح پڑھ رہی تھیں غلے مار رہے تھے کہ سامنے سے ایک گدڑی پوش فقیر آنکلا۔ اور اس نے نہایت ادب سے شہزادوں کو سلام کر کے عرض کیا کہ میاں صاحبزادو! ان بے زبان جانوروں کو کیوں ستاتے ہو انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے ان کے بھی جان ہے یہ بھی تمہاری طرح دُکھ اور تکلیف کی خبر رکھتے ہیں۔ مگر بے بس ہیں اور منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے تم بادشاہ کی اولاد ہو بادشاہوں کو اپنے ملک کے رہنے والوں پر محبت اور مہربانی کرنی چاہیئے یہ جانور بھی ملک میں رہتے ہیں ان کے ساتھ بھی رحم اور انصاف برتا جائے۔ تو شان بادشاہی سے دُور نہیں" بڑے شہزادے نے جس کی عمر ۱۸ برس کی تھی شرما کر غلیل ہاتھ سے رکھدی مگر چھوٹے مرزا نصیر الملک بگڑ کر بولے "جا رے جا۔ دو ٹکے کا آدمی ہم کو نصیحت کرنے نکلا ہے۔ تو کون ہوتا ہے۔ ہمکو سمجھانے والا۔ سیر و شکار سب کرتے ہیں ہم نے کیا تو کونسا گناہ ہوگیا،، فقیر بولا" صاحب عالم ناراض نہ ہوں۔ شکار ایسے جانوروں کا کرنا چاہیئے کہ ایک جان جائے تو دس پانچ جانوں کا پیٹ تو بھرے

اِن ننھی ننھی چڑیوں کے مارنے سے کیا نتیجہ۔ بیس۲ مارو گے تب بھی ایک آدمی شکم سیر نہو گا" نصیر مرزا فقیر کے دوبارہ بولنے سے آگ بگولا ہو گئے اور ایک غلہ غلیل میں رکھکر فقیر کے گھٹنے میں اس زور سے مارا کہ بچارہ منہ کے بل گر پڑا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "ہائے ٹانگ توڑ ڈالی" فقیر کے گرتے ہی شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے اور فقیر گھسٹتا ہوا سامنے کے قبرستان کی طرف چلنے لگا گھسٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "وہ تخت کیونکر آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفاک ظالم ہیں۔ لڑکے تو نے میری ٹانگ توڑ دی خدا تیری بھی ٹانگیں توڑے اور تجھ کو بھی اسی طرح گھسٹنا نصیب ہو۔

(۲)

توپیں گرج رہی تھیں گولے برس رہے تھے زمین پر چاروں طرف لاشوں کے ڈہیر نظر آتے تھے۔ شہر دہلی ویران اور سنسان ہوتا جاتا تھا کہ لال قلعے سے پھر دہی چند شہزادے گھوڑوں پر سوار بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے نظر آئے اور پہاڑ گنج کی طرف جانے لگے۔ دوسری طرف بیس پچیس گورے سپاہی دہا وا کرتے چلے آتے تھے اُنھوں نے ان نوعمر سواروں پر یک لخت بندوقوں کی باڑ ماری گولیوں نے گھوڑوں اور سواروں کو چھلنی کر دیا اور یہ سب شہزادے فرش خاک پر گر کر خون میں تڑپنے لگے۔ گورے جب قریب آئے تو دیکھا دو شہزادے جاں بحق ہو چکے ہیں۔ مگر ایک سانس لے رہا ہے۔ ایک سپاہی نے زندہ شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ اس کے کہیں زخم نہیں آیا گھوڑے کے گرنے سے معمولی کھرینچیں آگئی ہیں اور دہشت کے مارے غشی طاری ہو گئی ہے صحیح سالم

دیکھکر گھوڑے کی باگ ڈورسے شہزادے کے ہاتھ باندھ دیے گئے اور حراست میں کر کے دو سپاہیوں کے ہاتھ کمپ میں بھجوا دیا گیا۔ کمپ پہاڑی پر تھا جہاں گوروں کے علاوہ کالوں کی فوج بھی تھی جب بڑے صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ کا پوتا نصیر الملک ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور حکم ہوا کہ اسکو حفاظت سے رکھا جائے۔

(۳)

باغیوں کی فوجیں شکست کھا کر بھاگنے لگیں اور انگریزی لشکر یلغار کرتا ہوا شہر میں گھس گیا۔ بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہو گئے تیموری بزم کا چراغ جھلملا کر گل ہو گیا۔ اور جنگل شریف زادیوں کے برہنہ سروں اور کھلے چہروں سے آباد ہونے لگا۔ باپ بچوں کے سامنے ذبح ہونے لگے اور مائیں اپنے جوان بیٹوں کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھکر چیخیں مارنے لگیں۔

ابھی دار و گیر میں پہاڑی کمپ پر مرزا نصیر الملک رسی سے بندھے بیٹھے تھے کہ ایک پٹھان سپاہی دوڑا ہوا آیا اور کہا جائیے میں نے آپکی رہائی کے لئے صاحب سے اجازت حاصل کر لی ہے۔ جلدی بھاگ جاؤ ایسا نہ ہو کہ کسی دوسری بلا میں پھنس جاؤ۔

مرزا بچارے پیدل چلنا کیا جانیں حیران تھے کیا کریں۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا پٹھان کا شکریہ ادا کر کے نکلے اور جنگل کی طرف ہو لئے چل رہے تھے مگر یہ خبر نہ تھی کہ کہاں جاتے ہیں۔ ایک میل چلے ہونگے کہ پیروں میں چھالے پڑ گئے زبان خشک ہو گئی۔ حلق میں کانٹے پڑنے لگے تھک کر ایک درخت کے سایے میں گر پڑے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر آسمان کی طرف دیکھا کہ الٰہی یہ کیا غضب ہم پر ٹوٹا۔ ہم کہاں جائیں کدھر ہمارا ٹھکانہ ہے اوپر نگاہ اٹھائی

تو درخت پر نظر گئی دیکھا کہ فاختہ کا ایک گھونسلا بنا ہوا ہے اور وہ آرام سے اپنے انڈوں پر بیٹھی ہے، اس کی آزادی اور آسائش پر شہزادہ کو بڑا رشک آیا اور کہنے لگے کہ فاختہ! مجھ سے تو تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ آرام سے اپنے گھونسلے میں بے فکر بیٹھی ہے میرے لئے تو آج زمین آسمان میں کہیں جگہ نہیں ہے۔

تھوڑی دور ایک بستی نظر آتی تھی۔ ہمت کرکے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے چلنے نہ دیتے تھے مگر لشتم پشتم گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو عجب سماں نظر آیا۔ ایک درخت کے نیچے سینکڑوں گنوار جمع تھے اور چبوترہ پر ایک تیرہ سال کی معصوم لڑکی بیٹھی تھی جسکے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کان لہو لہان ہو رہے تھے۔ اور دہقانی اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ جونہی مرزا کی نگاہ اس بچی پر پڑی اور اس بیچاری نے مرزا کو دیکھا دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔

بھائی بہن کو اور بہن بھائی کو چمٹ کر رونے لگے۔ مرزا نصیر الملک کی یہ چھوٹی بہن اپنی والدہ کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر قلعہ قطب صاحب چلی گئی تھی۔ مرزا کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ اس آفت میں مبتلا ہو گئی ہوگی۔ پوچھا للہ تم یہاں کہاں؟ رو کر بولی

اکاجی گوجروں نے ہمکو لوٹ لیا نوکروں کو مار ڈالا اماں جان کو دوسرے گاؤں والے لیگئے اور مجھ کو یہاں لے آئے میری بالیاں انھوں نے نوچ لیں میرے طمانچے ہی طمانچے مارے ہیں۔

اتنا کہکر لڑکی کی ہچکی بندھ گئی اور پھر کوئی لفظ اسکی زبان سے نہ نکلا۔!

بےکس شہزادے نے اپنی غریب بہن کو دلاسا دیا اور ان گنواروں سے عاجزی کرنے لگا کہ اسکو چھوڑ دو۔ گوجر بگڑ کر بولے۔ ارے جا آیا بڑا اجیارا۔ ایک گنڈا سا ایسا مارینگے کہ گردن کٹ جائیگی۔ اسکو ہم دوسرے گاؤں سے لائے ہیں۔ دام دے جا اور لیجا۔

مرزا نے کہا۔ چودھریو! دام کہاں سے دوں میں تو خود تم سے روٹی کا ٹکڑا مانگنے کے قابل ہوں۔ دیکھو ذرا رحم کرو۔ کل تم ہماری رعیت تھے اور ہم بادشاہ کہلاتے تھے آج آنکھیں نہ پھیرو۔ خدا کسی کا وقت نہ بگاڑے۔ اگر ہمارے دن پھر گئے تو مالا مال کر دینگے۔ یہ سنکر گنوار بہت ہنسے اور کہنے لگے۔ اوہو! آپ بادشاہ سلامت ہیں۔ تب تو ہم تم کو فرنگیوں کے ہاتھ بیچیں گے اور یہ چھوکری تو اب ہمارے گاؤں کی ٹہل کریگی۔ جھاڑو دیگی۔ ڈھوروں کے آگے چارہ ڈالے گی۔ گوبر اٹھائے گی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے انگریزی فوج آگئی اور گاؤں والوں کو گھیر لیا اور چار چودھریوں کو اور ان دونوں شہزادے شہزادی کو پکڑ کر لیگئے۔

(۴)

چاندنی چوک کے بازار میں پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں اور جسکو انگریزی افسر کہدیتے کہ قابلِ دار ہے اسی کو پھانسی مل جاتی تھی ہر روز سینکڑوں آدمی دار پر لٹکائے جاتے گولیوں سے اڑائے جاتے اور تلوار سے ذبح ہوتے تھے۔ ہر طرف اس خونریزی سے تہلکہ تھا مرزا نصیر الملک اور ان کی بہن بھی بڑے صاحب کے سامنے پیش ہوئے اور صاحب نے ان دونوں کو خورد سال دیکھکر بے قصور سمجھا۔ اور چھوڑ دیا دونوں نجات پاکر ایک سوداگر کے ہاں نوکر ہوگئے لڑکی سوداگر کے بچے کو کھلاتی تھی۔ اور نصیر الملک بازار کا سودا سلف لایا کرتے تھے چند روز کے بعد لڑکی تو ہیضہ میں مبتلا ہو کر مر گئی اور مرزا کچھ دن ادھر نوکریاں چاکریاں کرتے رہے۔ آخر کار سرکار نے انکی پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کردی۔

ایک برس کا ذکر ہے۔ دہلی کے بازار چتلی قبر۔ کمرہ بنگش وغیرہ میں ایک پیر مرد جنکا چہرہ چنگیزی نسل کا پتہ دیتا تھا۔ کولہوں کے بل گھسٹتے پھرا کرتے تھے۔ انکے پاؤں شاید فالج سے بیکار ہوگئے تھے اسلئے ہاتھوں کو ٹیک کر کولوں کو گھسیٹتے ہوئے راستہ چلتے تھے۔ انکے گلے میں ایک جھولی ہوتی تھی۔ دو قدم چلتے اور راہ گیروں کو حسرت سے دیکھتے گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں

اپنی محتاجی ظاہر کر کے بھیک مانگتے تھے۔ جن لوگوں کو انکا حال معلوم تھا ترس کھا کر جھولی میں کچھ ڈالدیتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کا نام مرزا نصیر الملک ہے اور یہ بہادر شاہ کے پوتے ہیں۔ سرکاری پنشن قرضہ میں برباد کردی اور اب خاموش گداگری پر گذارہ ہے مجھ کو ان کے حال سے عبرت ہوتی تھی۔ اور جب ان کا ابتدائی قصہ جو کچھ خود ان کی زبانی اور کچھ دوسرے شہزادوں کی زبانی سُنا تھا یاد آتا تو دل ہل جاتا تھا کہ اس فقیر کا کہنا پورا ہوا جسکی ٹانگ میں انھوں نے غلہ مارا تھا شہزادہ صاحب کا بازار میں گھسٹتا پھرنا سخت سے سخت دل کو موم کر دیتا تھا اور خدا کے خوف سے دل کانپ جاتا تھا۔ اب ان شہزادہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

تیسرا افسانہ

یتیم شہزادہ کی ٹھوکریں

ماہ عالم ایک شہزادے کا نام تھا جو شاہ عالم بادشاہ دہلی کے نواسوں میں تھا۔ اور غدر میں اسکی عمر صرف گیارہ برس کی تھی۔ شہزادہ ماہ عالم کے باپ مرزا نوروز حیدر دیگر خاندانِ شاہی کی طرح بہادر شاہ کی سرکار سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے مگر انکی والدہ کے پاس قدیم زمانہ کا بہت سا اندوختہ تھا اسلئے انکو اس روپیہ کی چنداں پروا نہیں تھی اور وہ بڑی بڑی تنخواہوں کے شہزادوں کی طرح گذر اوقات کرتے تھے۔

جب غدر پڑا تو ماہ عالم کی والدہ بیمار تھیں علاج ہو رہا تھا۔ مگر مرض برابر ترقی کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عین اس روز جبکہ بہادر شاہ قلعہ سے نکلے اور شہر کی تمام رعایا پریشان ہو کر چاروں طرف بھاگنے لگی۔ ماہ عالم کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایسی گھبراہٹ کے موقع پر سب کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اس موت نے عجیب ہراس

پیدا کر دی۔ اِس وقت نہ کفن کا سامان ممکن تھا نہ دفن کا۔ نہ غسل دینے والی عورت میسر آسکتی تھی۔ نہ کوئی مُردے کے پاس بیٹھنے والا تھا۔ شہزادوں میں رسم ہو گئی تھی کہ وہ مُردے کے پاس نہ جاتے سب کام پیشہ وروں سے لیا جاتا تھا۔ جو اِس وقت کیلئے ہمیشہ موجود و تیار رہتے تھے۔ غدر کی عالمگیر مصیبت کے سبب کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو تجہیز و تکفین کی خدمت انجام کو پہنچاتا۔ گھر میں دو لونڈیاں تھیں لیکن وہ بھی مردے کو نہلانا نہ جانتی تھیں۔ خود مرزا نور وز حیدر اگرچہ پڑھے لکھے شخص تھے مگر چونکہ انکو ایسا کام پیش نہ آیا تھا اسلئے اسلامی طریق پر غسل و کفن سے وہ بھی واقفیت نہ رکھتے تھے۔

القصہ ان لوگوں کو اسی حیرانی و پریشانی میں کئی گھنٹے گذر گئے اتنے میں سُنا کہ انگریزی لشکر شہر میں گھس آیا ہے اور اب عنقریب قلعہ میں آیا چاہتا ہے۔ اِس خبر سے مرزا کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے اور جلدی سے لاش کو چارپائی پر ہی کپڑے اُتار کر نہلانا شروع کیا۔ نہلایا کیا۔ بس پانی کے لوٹے بھر بھر کر اوپر ڈال دیئے کفن کہاں سے ملتا شہر تو بند تھا۔ پلنگ پر بچھانے کی دو اُجلی چادریں لیں اور اِن میں لاش کو لپیٹ دیا اب یہ فکر ہوئی کہ دفن کہاں کریں باہر لیجانے کا تو موقع نہیں اسی سوچ میں تھے کہ گوروں اور سکھوں کی فوج کے چند سپاہی گھر میں آ گئے اور آتے ہی مرزا اور انکے لڑکے ماہ عالم کو گرفتار کر لیا اسکے بعد گھر کا سامان لوٹنے لگے۔ صندوق توڑ ڈالے الماریوں کے کواڑ اکھیڑ دیئے۔ کتابوں میں آگ لگا دی دونوں لونڈیاں غسلخانوں میں جا چھپی تھیں ایک سپاہی کی انپر نگاہ پڑ گئی جسنے دیکھتے ہی اندر گھُسکر سر کے بال پکڑے اور بچاریونکو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ اگرچہ ان فوجیوں کو لاش کا حال معلوم ہو گیا تھا مگر اُنھوں نے اسکی مطلق پرواہ نہ کی اور برابر لوٹ مار کرتے رہے۔ آخر قیمتی سامان کی گٹھریاں لونڈیوں اور خود مرزا نور وز حیدر اور اُنکے لڑکے ماہ عالم کے سر پر رکھیں اور بکریوں کی طرح انکو ہانکتے ہوئے گھر سے باہر لیچلے۔ اُس وقت مرزا نے اپنے لُٹے ہوئے گھر کو آخری حسرت بھری

نگاہوں سے دیکھا اور اپنی بیوی کی بے گور و کفن لاش کو اکیلا چارپائی پر چھوڑ کر ظلمی سپاہیوں کے ساتھ کوچ کیا۔

لونڈیوں کو تو بوجھ اُٹھانے اور چلنے پھرنے کی عادت تھی مرزا نوروز حیدر بھی قوی اور توانا تھے۔ بوجھ سر پر اُٹھائے بے تکان چل رہے تھے۔ مگر غریب ماہ عالم کی بُری حالت تھی اوّل تو اس کے سر پہ بوجھ اس کی عمر اور بساط سے زیادہ تھا اسکے علاوہ یہ شہزادہ قدرتی طور پر نہایت نازک اور کمزور واقع ہوا تھا۔ اس پر سُونے پر سُہاگہ یہ ہوا کہ ماں کے مرنے کا غم تھا۔ رات سے روتے روتے آنکھیں سوج گئی تھیں۔ خالی ہاتھ چلنے سے چکر آتے تھے کجا یہ نوبت کہ سر پر بوجھ پیچھے چمکتی ہوئی تلواریں اور جلدی چلنے کی تہدید، تاکید بیچارے کے پاؤں لڑکھڑاتے تھے۔ دم چڑھ گیا تھا۔ بدن پسینہ پسینہ ہو گیا تھا آخر نہایت مجبوری کی حالت میں باپ سے کہا "ابا حضرت مجھ سے تو چلا نہیں جاتا۔ گردن بوجھ کے مارے ٹوٹی جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آرہا ہے ایسا نہ ہو گر پڑوں" باپ سے اپنے لاڈلے اکلوتے بچے کی یہ مصیبت بھری باتیں سُنی نہ گئیں اور اس نے گڑگڑا کر سپاہی سے کہا "صاحب اس بچے کا اسباب بھی مجھ کو دیدو یہ بیمار ہے گر پڑیگا گورا مرزا کی زبان بالکل نہ سمجھا اور اس طرح ٹھہرنے اور بات کرنے کو گستاخی اور بدنیتی سمجھ کر دو تین مُکے کمر میں مارے اور آگے دھکا دیدیا۔ مظلوم مرزا نے مار بھی کھائی مگر مامتا کے مارے لڑکے کا بوجھ لیکر بغل میں لے لیا۔ گورے کو یہ حرکت بھی پسند نہ آئی اور اُس نے جبراً مرزا سے گٹھری لیکر ماہ عالم کے سر پر رکھدی اور ایک گھونسا اس بیکس و ناتوان کے بھی مارا گھونسا کھا کر ماہ عالم آہ کہکر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا۔ مرزا نوروز اپنے لخت جگر کی حالت دیکھکر جوش میں آگئے اور اسباب پھینک کر ایک مکہ گورے کے کلے پر رسید کیا اور پھر فوراً ہی دوسرا گھونسہ اسکی ناک پر مارا جس سے گورے کی ناک کا بانسہ پھٹ گیا اور خون کا فوارہ چلنے لگا سکھ سپاہی [illegible] سری طرف

چلے گئے تھے۔ اس وقت فقط دو گورے ان قیدیوں کے ساتھ تھے اور کیمپ کو لئے جارہے تھے۔ دوسرے گورے نے اپنے ساتھی کی یہ حالت دیکھکر مرزا کے ایک سنگین ماری مگر خدا کی قدرت سنگین کا وار اوچھا پڑا اور وہ مرزا کی کمر کے پاس سے کھال چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ تیموری شہزادہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور لپک کر ایک مکہ اس گورے کی ناک پر بھی مارا۔ یہ مکہ بھی ایسا کاری پڑا کہ ناک پچک گئی اور خون بہنے لگا گورے یہ حالت دیکھکر پستول و کرچ تو بھول گئے اور ایک بارگی دونوں کے دونوں مرزا کو چمٹ گئے اور گھونسوں سے مارنے لگے۔ لونڈیوں نے جو یہ حالت دیکھی تو اسباب پھینک رستہ کی خاک مٹھیوں میں بھر گوروں کی آنکھوں میں جھونک دی۔ اس ناگہانی آفت سے گورے تھوڑی دیر کے لئے بیکار ہو گئے اور ان کی کرچ مرزا کے ہاتھ آگئی۔ مرزا نے فوراً کرچ گھسیٹ لی اور ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ کرچ نے شانے سے سینہ تک کاٹ ڈالا۔ اسکے بعد دوسرے گورے پر حملہ کیا اور اسے بھی ذبح کر دیا ان دونوں کو ہلاک کر کے ماہ عالم کی طرف متوجہ ہوئے وہ بالکل بیہوش تھا۔ باپ کے گود میں لیتے ہی آنکھیں کھولدیں اور باہیں گلے میں ڈالکر رونے لگا۔ مرزا اسی حالت میں تھے کہ پیچھے سے دس بارہ گورے اور سکھ سپاہی آگئے اور اُنھوں نے اپنے دو ساتھیوں کو خون میں نہایا دیکھکر مرزا کو گھیر لیا اور لڑکے کو اُنکسے جُدا کر کے حال پوچھا۔ مرزا نے سارا واقعہ سچ سچ کہدیا سُنتے ہی گوروں کی حالت غصہ سے غیر ہو گئی۔ اُنھوں نے پستول کے چھ فیر یکدم کر دیئے جن سے زخمی ہو کر مرزا گر پڑے اور آناً فاناً میں تڑپ کر مر گئے۔ مرزا نوروز کی لاش کو وہیں چھوڑ دیا گیا اور ماہ عالم کو لونڈیوں سمیت پہاڑی کے کیمپ میں لے گئے۔

جب دہلی کی فتح سے اطمینان ہو گیا تو لونڈیاں دو پنجابی افسروں کو دیدی گئیں اور ماہ عالم ایک انگریز افسر کی خدمتگاری پر مامور ہوئے۔ جب تک یہ انگریز دہلی

میں رہے ماہ عالم کو زیادہ تکلیف نہ تھی کیونکہ صاحب کے پاس کئی خانساماں اور نوکر چاکر تھے اسواسطے زیادہ کام کاج نہ کرنا پڑتا تھا لیکن چند روز کے بعد یہ صاحب رخصت لیکر ولایت چلے گئے اور ماہ عالم کو ایک دوسرے افسر کے حوالہ کر گئے جو میرٹھ چھاؤنی میں تھے۔ ان افسر کا مزاج سخت تھا بات بات پر ٹھوکریں مارتے تھے۔ ماہ عالم اس مار دھاڑ کو برداشت نہ کر سکے اور ایک دن بھاگنے کا ارادہ کیا چنانچہ پچھلی رات کو گھر سے نکلے۔ پہرہ دار نے ٹوکا تو کہدیا فلاں صاحب کا نوکر ہوں اور انکے کام کو فلاں گاؤں میں جاتا ہوں تاکہ سویرے ہی پہنچ جاؤں اس حیلہ سے جان بچائی اور جنگل کا راستہ لیا۔

چھوٹی عمر۔ راستے سے بیخبر۔ پکڑے جانیکا خوف عجب پریشانی کا عالم تھا آخر ہزار وقت صبح ہوتے ہوتے میرٹھ سے تین چار کوس کے فاصلہ پر پہنچ گئے۔ سامنے گاؤں تھا وہاں جاکر ایک مسجد میں ٹھہر گئے ملا صاحب نے سوالات شروع کئے تو کون ہے کہاں سے آیا ہے۔ کہاں جائیگا۔ ماہ عالم نے ان کو باتوں میں ٹالا یہاں ایک فقیر بھی ٹھہرے ہوئے تھے اُنھوں نے جو ماہ عالم کی شریفانہ صورت دیکھی۔ تو محبت سے پاس بُلایا اور رات کی بچی ہوئی روٹی سامنے رکھی۔ ماہ عالم نے شاہ صاحب کو ہمدرد پاکر اپنی مصیبت کی داستان اوّل سے آخر تک سنائی شاہ صاحب یہ کیفیت سنکر رونے لگے اور ماہ عالم کو سینہ سے لگاکر پیار کیا اور تسلی کی باتیں کرنے لگے۔ اسکے بعد کہا اب تم فکر نہ کرو میرے ساتھ رہو خدا حافظ و ناصر ہے۔

چنانچہ اُنھوں نے ایک رنگین کرتا اُنکو پہنا دیا اور ساتھ لیکر چل کھڑے ہوئے دو چار روز تو یہ حالت رہی کہ جہاں ماہ عالم نے کہا حضرت اب تو میں تھک گیا تو کسی گاؤں میں ٹھیر جاتے۔ لیکن پھر ان کو بھی چلنے کی عادت ہو گئی اور پوری منزل چلنے لگے مہینے بھر میں اجمیر شریف پہنچے۔ یہاں ان صاحب کے پیر جو بغداد کے رہنے والے تھے

بیٹے ملے ان پیر صاحب کو جب ماہ عالم کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی مہربانی سے پیش آئے اور ان دونوں کو ساتھ لیکر بمبئی چلے گئے۔ بمبئی کے قریب بانررہ میں شاہ صاحب رہتے تھے وہیں انکو بھی رکھا اور کئی برس یہاں رہ کر ماہ عالم نے قرآن شریف اور مسئلہ مسائل کی کتابیں پڑھیں اور نماز روزے سے خوب واقف ہو گئے۔ تب شاہ صاحب نے ان کی وہیں کسی نیک بخت سے شادی کردی اور انھوں نے اسی جگہ رہنا اختیار کر لیا۔

چوتھا فسانہ

شہزادی کی بپتا

ہونے کو تو غدر پچاس برس کی کہانی ہے۔ مگر مجھ سے پوچھو تو کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اُن دنوں میری عمر سولہ سترہ برس کی تھی میں اپنے بھائی سے دو برس چھوٹی اور میرے والی بہن ناز بانو سے چھ سال بڑی ہوں۔ میرا نام سلطان بانو ہے ابا جان مرزا قویش بہادر ظل سبحانی حضرت بہادر شاہ کے فرزند تھے۔ بھائی یاد شاہ اور ہم بہنوں میں بڑی محبت تھی۔ بس ہر ایک دوسرے پر فدا تھا۔ آکا بھائی کے لئے باہر کئی اُستاد طرح طرح کی باتیں سکھانے والے تھے، کوئی حافظ تھا اور کوئی مولوی کوئی خوشنویس تھا اور کوئی تیر انداز۔

اور ہم محل میں سینا پرونا اور کشیدہ کاڑھنا مغلانیوں سے سیکھتے تھے دستور تھا کہ حضرت ظل سبحانی بچوں اور بڑوں پر خاص نظر عنایت رکھتے تھے۔ ان کو صبح کا کھانا شاہی دسترخوان پر حضور والا کے ہمراہ کھلایا جاتا تھا۔ چنانچہ ظل سبحانی مجھ کو بھی بہت چاہتے تھے اور میں ہمیشہ صبح کے وقت کھانے کے واسطے بلائی جاتی تھی جب میں نے ہوش سنبھالا اور بچی

ابو بکر کے لڑکے مرزا سہراب سے میری نسبت ٹھیر گئی تو حضور کے دستر خوان پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ کیونکہ وہاں مرزا سہراب بھی کھانا کھانے آیا کرتے تھے، اگرچہ ہمارے کل خاندان میں باہم پردہ نہ تھا اور نہ اب ہے۔ شرعی نامحرم گھر میں آتے جاتے تھے مگر میں اپنی طبیعت سے مجبور تھی۔ میں ایک آن کے لئے کسی غیر مرد کے سامنے جانا گوارا نہ کرتی تھی۔ پر کیا کرتی حضور کے حکم کے خلاف دستر خوان پر کس طرح نہ جاتی۔ لیکن یہ غنیمت تھا کہ آداب سلطانی کے باعث سب نظریں جھکائے رکھتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ ایک بچہ بھی ادھر اُدھر دیکھے۔ یا آواز سے بولے۔

قاعدہ تھا کہ جب حضور معلی کوئی خاص کھانا کسی کو مرحمت فرماتے تو وہ بچہ ہو یا جوان عورت ہو یا مرد اپنی جگہ سے اُٹھکر جائے ادب پر جاتا اور جھک کر تین سلام بجالاتا۔ ایک دن میرے ساتھ بھی یہی اتفاق پیش آیا کہ حضور نے ایک نئی قسم کا ایرانی کھانا مجکو عطا کیا۔ اور فرمایا سلطانہ! تو تو کچھ کھاتی ہی نہیں، ادب اور لحاظ ایک حد تک اچھا ہوتا ہے نہ کہ اتنا کہ دستر خوان پر سے بھوکا اُٹھا جائے۔ میں کھڑی ہوئی اور جائے ادب پر جا کر تین آداب بجالائی مگر کچھ نہ پوچھو اس مشکل سے آئی گئی کہ دل ہی جانتا ہے ہر قدم پر اوبھتی تھی اور اوسان خطا ہوئے جاتے تھے۔

اب میں سوچتی ہوں کہ وہ زمانہ کیا ہوا وہ خوشی کے دن کہاں چلے گئے جب ہم اپنے محلوں میں آزاد و بیفکر پھرا کرتے تھے ظل سبحانی کا سایہ سر پر تھا اور لوگ ہمیں ملکہ عالم کہکر پکارتے تھے۔ دنیا کے اُتار چڑھاؤ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ جب حضور معلے مقبرہ ہمایوں میں گرفتار کئے گئے تو مرزا سہراب تلوار گھسیٹ کر دوڑے مگر دوسرے گورے نے ان کے گولی ماردی اور وہ ایک آہ کر کے گر پڑے اور تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے اور میں بت بنی تماشا دیکھتی رہی اتنے میں خواجہ سرا آیا اور کہنے لگا بیگم کیوں کھڑی ہو چلو تمہارے ابا جان نے بلایا ہے

میں اسی بیخودی کے عالم میں اُس کے ساتھ ہولی۔ دریائی دروازے سے اُتر کر دیکھا
کہ ابا جان مرزا قویش بہادر گھوڑے پر سوار ننگے سر کھڑے ہیں۔ تمام چہرے اور سر
کے بال خاک آلودہ ہو رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی آنسو بھر لائے اور فرمایا تو سلطانہ آج
ہمارا بھی کوچ ہے۔ جوان بیٹا جس کے سہرے کی آرزو تھی آنکھوں کے سامنے ایک سکھ
کی سنگین کا نشانہ بن گیا۔ یہ سنتے ہی میں نے ایک چیخ ماری اور ہائے بھائی یا در
کہکر رونے لگی۔ وہ گھوڑے سے اُتر آئے۔ مجکو اور ناز بانو کو گلے لگا کر پیار اور
تسلی دینے لگے اور کہا بیٹی اب لوگ میری تلاش میں ہیں۔ میں بھی دو چار گھڑی کا مہمان
ہوں۔ تم ماشاء اللہ جوان اور سمجھدار ہو اپنی چھوٹی بہن کو دلا سا دو اور آنیوالی مصیبتوں
پر صبر کرو۔ خبر نہیں اسکے بعد کیا پیش آنیوالا ہے۔ جی تو نہیں چاہتا کہ تمکو تن تنہا چھوڑ کر کہیں
جاؤں پر ایک نہ ایک دن تمہیں بن باپ کا بننا ہی پڑے گا۔ ناز بانو تو ابھی بچہ ہے
اس کی دلداری کرنا اور نیکی سے زندگی بسر کرنا۔ اور دیکھو ناز بانو اب تم شہزادی
نہیں ہو کسی چیز کے لئے ضد نہ کرنا۔ جو میسر آئے شکر کر کے کھالینا اور اگر کوئی شخص کچھ
کھاتا ہو تو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھنا ورنہ لوگ کہینگے کہ شہزادیاں بڑی بدنیت ہوتی ہیں
پھر ہم دونوں کو خواجہ سرا کے سپرد کر کے کہا ان کو جہاں ہمارے خاندان کے اور آدمی
ہوں پہنچا دینا اس کے بعد ہمکو پیار کیا اور روتے ہوئے گھوڑا دوڑاتے جنگل میں
گھس گئے۔ پھر پتہ نہ لگا کہ وہ کیا ہوئے۔ خواجہ سرا ہمکو لے چلا۔ یہ ہمارے گھر کا قدیمی
نمکخوار تھا۔ تھوڑی دور تک ناز بانو جو نازوں کی پلی ہوئی تھی چلی مگر پھر پاؤں کی طاقت
نے جواب دیدیا اور دو قدم چلنا دُوبھر ہو گیا۔ مجکو بھی کبھی پیدل چلنے کا اتفاق نہ ہوا تھا
جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی تھی مگر بانو کو لئے ہوئے چلی جاتی تھی اتنے میں ناز بانو کے ایک
نوکدار کانٹا چبھ گیا اور وہ ہائے کہکر گر پڑی۔ میں نے جلدی سے اُس کو اُٹھایا اور
کانٹا نکالنے لگی۔ مگر ہوا خواجہ سرا کھڑا دیکھا کیا اور یہ نہ ہوا کہ میرا ہاتھ بٹالیتا بلکہ چلنے کی

جلدی کرنے لگا۔ بہن بولی آپا جان مجھ سے پیدل نہیں چلا جاتا۔ ناظر کو بھیجکر گھر سے پالکی منگالو۔ گھر اور پالکی کا نام سُنکر میرا جی بھر آیا اور اُس کو تسلی دینے لگی خواجہ سرا نے پھر کہا چلو بس ہو چکا جلدی چلو۔ نازبانو کا مزاج تیز تھا۔ وہ نوکروں کو ہمیشہ سخت سُست کہہ لیا کرتی تھی اور یہ لوگ دم بخود ہو کر سُن لیتے تھے۔

اسی خیال سے اُس نے خواجہ سرا کو پھر دو ایک باتیں سنا دیں۔ کمبخت کو سنتے ہی اتنا غصہ آیا کہ آپے سے باہر ہو گیا اور بڑی بے ترسی سے بن ماں باپ کی دکھیا بچی کے ایک طمانچہ مارا۔ بانو بلبلا گئی۔ وہ کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ پٹی تھی یا ایسا طمانچہ لگا۔

اس کے رونے سے مجکو بھی بے اختیار رونا آ گیا ہم تو رو رہے تھے اور خواجہ سرا کہیں چلا گیا۔ پھر خبر نہ ملی کہ وہ کیا ہوا۔ ہم دونوں بمشکل تمام گرتے پڑتے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ میں پہنچے۔ یہاں دہلی کے اور خاص ہمارے خاندان کے سینکڑوں آدمی تھے مگر ہر ایک اپنی اپنی مصیبت میں گرفتار قیامت کا نمونہ تھا کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ اسی اثنا میں دبا پھیلی اور پیاری بہن نازبانو اس میں رخصت ہو گئیں میں اکیلی رہ گئی۔ امن ہوا جب بھی مجھ دکھیا کو سکھ نہ ملا آخر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انگریزی سرکار نے ہم لوگوں کی پرورش کرنی چاہی اور میرا پانچ روپیہ مہینہ وظیفہ مقرر ہوا جو اب بھی ملتا ہے۔

پانچواں فسانہ
فاقہ میں روزہ
دہلوی تاجدار کے ایک کنبہ کا فسانہ

جب دہلی زندہ تھی اور ہندوستان کے دل کہلانے کا حق رکھتی تھی لال قلعہ پر تیموری

کا آخری نشان لہرا رہا تھا۔ اُنھیں دنوں کا ذکر ہے کہ مرزا سلیم بہادر (جو ابو ظفر بہادر شاہ کے بھائی تھے اور غدر سے پہلے ایک اتفاقی قصور کے سبب قید ہو کر الٰہ آباد چلے گئے تھے) اپنے مردانہ مکان میں بیٹھے ہوئے دوستوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں زنان خانہ سے ایک لونڈی باہر آئی اور ادب سے عرض کیا کہ حضور بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ میرزا سلیم فوراً محل میں چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر میں مغموم واپس آئے ایک بے تکلف ندیم نے عرض کیا۔

"خیر باشد مزاج عالی مکدر پاتا ہوں" مرزا نے مسکرا کر جواب دیا "نہیں کچھ نہیں بعض اوقات اماں حضرت خواہ مخواہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ کل شام کو افطاری کے وقت نتھن خاں گویا کچھ گا رہا تھا اور میرا دل بہلا رہا تھا۔ اُس وقت اماں حضرت قرآن شریف پڑھا کرتی ہیں انکو یہ شور و غل ناگوار معلوم ہوا۔ آج ارشاد ہوا ہے کہ رمضان میں سے رمضان گانے بجانے کی محفلیں بند کر دی جائیں۔ بھلا میں اِس تفریحی عادت کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں ادب کے لحاظ سے قبول تو کر لیا مگر اِس پابندی سے جی اُلجھتا ہے حیران ہوں کہ یہ سولہ دن کیونکر بسر ہونگے۔

مصاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا حضور یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد تشریف لے چلا کیجئے عجب بہار ہوتی ہے رنگ برنگ کے آدمی طرح طرح کے جمگھٹے دیکھنے میں آئیں گے۔ خدا کے دن ہیں خدا والوں کی بہار بھی دیکھئے۔

مرزا نے اِس صلاح کو پسند کیا اور دوسرے دن مصاحبوں کو لیکر جامع مسجد پہنچے وہاں جا کر عجب عالم دیکھا۔ جگہ جگہ حلقہ بنائے لوگ بیٹھے ہیں کہیں قرآن شریف کے دور ہو رہے ہیں۔ رات کے قرآن سنانے والے حفاظ ایک دوسرے کو قرآن سُنا رہے ہیں۔ کہیں مسائل دین پر گفتگو ہو رہی ہے۔ دو عالم کسی فقہی مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں

اور بیسیوں آدمی گردمیں بیٹھے مزے سے سُن رہے ہیں کسی جگہ توجہ اور مراقبہ کا حلقہ ہے کہیں کوئی صاحب وظائف میں مشغول ہیں الغرض مسجد میں چاروں طرف اللہ والوں کا ہجوم ہے کُل جَدِیدٍ لَذِیذٌ۔ مرزا کو یہ نظارہ بہت پسند آیا اور وقت بہت لطف سے کٹ گیا۔ اتنے میں افطار کا وقت قریب آیا سینکڑوں خوان افطاری کے آنے لگے اور لوگوں میں افطاریاں تقسیم ہونے لگیں۔ خاص محل سلطانی سے متعدد خوان پرتکلف چیزوں سے آراستہ روزانہ جامع مسجد میں بھیجے جاتے تھے۔ تاکہ روزداروں میں افطاری تقسیم کیجائے اسکے علاوہ قلعہ کی تمام بیگمات اور شہر کے سب امرا علیحدہ افطاری کے سامان بھیجتے تھے اسلئے ان خوانوں کی گنتی سینکڑوں تک پہنچ جاتی تھی۔ چونکہ ہر امیر کوشش کرتا تھا کہ اسکا سامان افطاری دوسروں سے بڑھکر رہے اسلئے ریشمی رنگ برنگ کے خوان پوش اور ان پر قیمتی جھالریں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہوتی تھیں اور مسجد میں ان کی عجب آرائش ہو جاتی تھی۔

میرزا کے دل پر اس دینی چرچے اور شان وشوکت نے بڑا اثر ڈالا۔ اور آپ برابر روزانہ مسجد میں آنے لگے۔ گھر میں وہ دیکھتے کہ سینکڑوں فقرا کو سحری اور اول شب کا کھانا روزانہ شہر کی خانقاہوں اور مسجدوں میں بھجوایا جاتا تھا اور باوجود رات دن کی لہو ولعب کے یہ دن ان کے گھر میں بڑی برکت اور چہل پہل کے معلوم ہوتے تھے۔

مرزا سلیم کے ایک بھانجے مرزا شہ زور نوعمری کے سبب اکثر اپنے ماموں کی صحبت میں بے تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک تو وہ وقت تھا جو آج خواب و خیال کی طرح یاد آتا ہے اور ایک وہ وقت آیا کہ دہلی زیر وزبر ہو گئی۔ قلعہ برباد کر دیا گیا امیروں کو پھانسیاں مل گئیں ان کے گھر اُکھڑ گئے ان کی بیگمات ماماگیری کرنے لگیں اور مسلمانوں کی سب شان وشوکت تاراج ہو گئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں جامع مسجد جانیکا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جگہ جگہ چولہے بنے ہوئے ہیں سپاہی روٹیاں پکا رہے ہیں گھوڑوں کے دانے دلے جا رہے ہیں گھانس کے انبار لگے ہوئے ہیں اور شاہجہان کی خوشبودار

اور بے مثل مسجد اصطبل نظر آتی ہے اور پھر جب مسجد واگزاشت ہوگئی اور سرکار نے اس کو مسلمانوں کے حوالے کردیا تو رمضان ہی کے مہینے میں پھر جانا ہوا۔ دیکھا چند مسلمان میلے کچیلے پیوند لگے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں دو چار قرآن شریف کا دور کر رہے ہیں۔ اور کچھ اسی پریشان حالی میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ افطاری کے وقت چند آدمیوں نے کھجوریں اور دال سیو بانٹ دیئے کسی نے ترکاری کے قتلے تقسیم کردیئے۔ نہ وہ اگلا ساسماں نہ وہ اگلی سی چہل پہل۔ نہ وہ پہلی سی شان و شوکت۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بیچارے فلک کے مارے چند لوگ جمع ہو گئے ہیں۔

اس کے بعد آجکل کا زمانہ بھی دیکھا جبکہ مسلمان چاروں طرف سے دب گئے ہیں انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان تو مسجد میں نظر ہی کم آتے ہیں۔ غریب غرباء آئے تو ان سے رونق کیا خاک ہوسکتی ہے۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ مسجد آباد ہے اگر مسلمانوں کے افلاس کا یہی عالم رہا تو آئندہ خبر نہیں کیا نوبت آئے۔

مرزا شہ زور کی باتوں میں بڑا درد اور اثر تھا۔ ایک دن میں نے ان سے غدر کا قصہ اور تباہی کا فسانہ سننا چاہا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اس کے بیان کرنے میں عذر مجبوری ظاہر کرنے لگے لیکن جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اپنی دردناک کہانی اس طرح سنائی۔

"جب انگریزی توپوں نے کرچوں اور سنگینوں نے حکمانہ توڑ جوڑ نے ہمارے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔ تاج سر سے اتار لیا۔ تخت پر قبضہ کر لیا۔ شہر میں آتشناک گولیوں کا مینہ برس چکا۔ سات پردوں میں رہنے والیاں بے چادر ہو کر بازار میں اپنے وارثوں کی بے کفنی لاشوں کو دیکھنے نکل آئیں۔ چھوٹے بن باپ کے بچے ابا ابا پکارتے ہوئے بے یار و مددگار پھرنے لگے۔ حضور ظل سبحانی جن پر ہم سب کا سہارا تھا قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے اس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ کمسن بہن اور حاملہ بیوی کو ساتھ لیکر اور اجڑے قافلہ کا لاحہ بنکر گھر سے کوچ کیا۔

ہم لوگ دو رتھوں میں سوار تھے۔ سیدھے غازی آباد کا رخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ اس لئے شاہدرہ سے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچکر رات کو آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ چھتر پور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا مگر اتنی مہربانی کی کہ ہمکو زندہ چھوڑ دیا۔ وہ لق ودق جنگل۔ تین عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی ایک بڑھاپے سے لاچار، دو قدم چلنا دشوار دوسری حاملہ اور بیمار، تیسری دس برس کی معصوم لڑکی زار و نزار عورتیں روتی تھیں اور بیان کر کرکے روتی تھیں۔ میرا کلیجہ ان کے بیان سے پھٹا جاتا تھا۔ والدہ کہتی تھیں یا الٰہی ہم کہاں جائیں کسکا سہارا ڈھونڈیں ہمارا تاج و تخت لٹ گیا۔ تو ٹوٹا بوریا اور دامن کی جگہ تو دے اس بیمار پیٹ والی کو کہاں لیکر بیٹھوں۔ اس معصوم بچی کو کس کے حوالے کروں جنگل کے درخت بھی ہمارے دشمن ہیں کہیں سایہ نظر نہیں آتا۔ بہن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اور ہم سب کا منہ تکتی تھی مجھکو اسکی معصومانہ بیکسی پر برابر ترس آتا تھا آخر مجبور میں نے عورتوں کو دلاسا دیا اور آگے چلنے کی ہمت بندھائی۔ گاؤں سامنے نظر آتا تھا غریب عورتوں نے چلنا شروع کیا۔ والدہ صاحبہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھیں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب وہ یہ کہتیں۔

"تقدیر انکو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو تاجوروں کے ٹھوکریں مارتے تھے قسمت نے انکو بےبس کر دیا جو بیکسوں کے کام آتے تھے ہم چنگیزی کی نسل ہیں جسکی تلوار سے زمین کانپتی تھی ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہر یاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہجہاں کے گھر والے ہیں جس نے ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھا دی اور دنیا بے نظیر مسجد دہلی کے اندر بنا دی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبے میں ہیں ہم عزت والے تھے زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانا نہیں ملتا وہ کیوں سرکشی کرتی ہے آج ہم پر مصیبت ہے آج ہم پر آسمان روتا ہے"

تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ القصہ بہزار دقت و دشواری گرتے پڑتے گاؤں میں پہنچے۔ یہ گاؤں مسلمان میواتیوں کا تھا اُنھوں نے ہماری خاطر کی اور اپنی چوپاڑ میں ہمکو ٹھہرا دیا۔

کچھ روز تو ان مسلمان گنواروں نے ہمارے کھانے پینے کی خبر رکھی اور چوپاڑ میں ہمکو ٹھہرائے رکھا۔ لیکن کب تک یہ بار اُٹھا سکتے تھے اُکتا گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میاں جی چوپاڑ میں ایک برات آنے والی ہے۔ تو دوسرے چھپر میں چلا جا اور رات دن خالی دبیکار، بیٹھے کیا کرے ہے کچھ کام کیوں نہیں کرتا۔ میں نے کہا " بھائی جہاں تم کہوگے وہیں جا پڑینگے، ہمیں چوپاڑ میں رہنے کی ہوس نہیں ہے۔ جب فلک نے عالیشان محل چھین لئے تو اِس کچے مکان پر ہم کیا ضد کرینگے۔ اور رہی کام کرنے کی بات سو میرا جی تو خود گھبراتا ہے خالی بیٹھے بیٹھے طبیعت اُکتائی جاتی ہے۔ مجکو کوئی کام بتاؤ ہو سکے گا تو آنکھوں سے کروں گا۔ اِن کا چودھری بولا۔ ہم نے کے بیر(ہمیں کیا خبر) کہ تو کے کام (کیا کام) کر سکے ہے" میں نے جواب دیا میں سپاہی زادہ تیغ تفنگ چلانا میرا ہنر ہے اسکے علاوہ اور کوئی کام نہیں جانتا" گنوار ہنس کر کہنے لگے " نہ بابا یہاں تو ہل چلانا ہو گا۔ گھاس کھودنی پڑیگی ہم نے تلوار کے ہنر کیا کرنے ہیں" گنواروں کے اِس جواب سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جواب دیا کہ بھائیو مجکو تو ہل چلانا اور گھاس کھودنی نہیں آتی۔ مجکو روتا دیکھکر گنواروں کو رحم آ گیا اور بولے " اچھا تو ہمارے کھیت کی رکھوالی کیا کر اور تیری عورتیں ہمارے گاؤں کے کپڑے سی دیا کریں فصل پر تجکو اناج دیدیا کریں گے جو تجکو برس دن کو کافی ہو گا۔

چنانچہ یہی ہوا کہ میں سارا دن کھیت پر جانور اڑایا کرتا تھا اور گھر میں عورتیں کپڑے سیتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بھادوں کا مہینہ آیا اور گاؤں میں سب کو بخار آنے لگا میری اہلیہ اور بہن کو بھی بخار نے آن دبایا۔ وہ گاؤں وہاں دوا اور حکیم کا کیا ذکر۔ خود لوٹ پیٹکر اچھے ہو جاتے ہیں۔ مگر ہمکو دواؤں کی عادت تھی سخت تکلیف اُٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں ایک دن اِس زور کی بارش ہوئی کہ جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں کمر کمر پانی ہو گیا

گاؤں والے تو اس کے عادی تھے لیکن ہماری حالت اس طوفان کے سبب مرنے سے بدتر ہو گئی۔ چونکہ پانی ایک دفعہ ہی رات کے وقت گھس آیا تھا اسلئے ہماری عورتوں کی چارپائیاں بالکل غرق آب ہو گئیں اور عورتیں چیخیں مارنے لگیں آخر بڑی مشکل سے چھپر کی بلیوں میں دو چارپائیاں اڑا کر عورتوں کو ان پر بٹھایا۔ پانی گھنٹہ بھر میں اُتر گیا۔ مگر غضب یہ ہوا کہ کھانے کا اناج اور اوڑھنے بچھانے کے کپڑے تر کر گیا۔ پچھلی رات میری بیوی کے دردِ زہ شروع ہوا اور ساتھ ہی جاڑے سے بخار بھی آیا اس وقت کی پریشانی بس بیان کرنے کے قابل نہیں۔ تدبیر اگھٹ مینہ کی جھڑی کپڑے سب گیلے آگ کا سامان نا ممکن حیران تھے الٰہی کیا انتظام کیا جائے۔ درد بڑھنا شروع ہوا اور مریضہ کی حالت نہایت ابتر ہو گئی یہانتک کہ تڑپنے لگی اور تڑپتے تڑپتے جان دیدی بچہ پیٹ ہی میں رہا۔

چونکہ وہ ساری عمر ناز و نعمت میں پلی تھیں غدر کی مصیبتیں ہی انکی ہلاکت کے لئے کافی تھیں خیر اس وقت تو جان بچ گئی مگر یہ بعد کا جھٹکا ایسا بڑا لگا کہ جان لیکر گیا۔

صبح ہو گئی گاؤں والوں کو خبر ہوئی تو اُنھوں نے کفن وغیرہ منگوا دیا اور دوپہر تک یہ محتاج شہزادی گورِ غریباں میں ہمیشہ کے لئے جا سوئی۔

اب ہمکو کھانے کی فکر ہوئی کیونکہ اناج سب بھیگ کر سڑ گیا تھا گاؤں والوں سے بھی مانگتے ہوئے لحاظ آتا تھا وہ بھی ہماری طرح اسی مصیبت میں گرفتار تھے۔

تاہم بچارے گاؤں کے چودھری کو خود ہی خیال ہوا اور اس نے قطب صاحب سے ایک روپیہ کا آٹا منگوا دیا وہ آٹا نصف کے قریب خرچ ہوا ہوگا کہ رمضان شریف کا چاند نظر آیا والدہ صاحبہ کا دل بہت نازک تھا وہ ہر وقت گذشتہ زمانہ کو یاد کیا کرتی تھیں رمضان کا چاند دیکھکر اُنھوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئیں میں سمجھ گیا کہ ان کو اگلا وقت یاد آگیا ہے تسلی کی باتیں کرنے لگا جس سے اُنکو کچھ ڈھارس ہو گئی۔

چار پانچ دن تو آرام سے گذر گئے مگر جب آٹا ختم ہو چکا تو بڑی مشکل درپیش ہوئی سوال

کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اور پاس ایک کوڑی نہ تھی۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا بھوک کے مارے کلیجہ مُنہ کو آتا تھا۔

والدہ صاحبہ کی عادت تھی کہ اِس قسم کی تکلیف کے وقت بیان کرکرکے رویا کرتی تھیں مگر آج وہ بڑے اطمینان سے خاموش تھیں۔ انکی خاموشی واطمینان سے میرے دلکو بھی سہارا ہوا اور چھوٹی بہن کو جس کے چہرے پر بھوک کے مارے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں دلاسا دینے لگا وہ معصوم بھی میرے سمجھانے سے نڈھال ہوکر چار پائی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔ بھوک میں نیند کہاں آتی ہے بس ایک غوطہ سا تھا۔

اِس غوطہ اور ناتوانی کی حالت میں سحری کا وقت آگیا والدہ صاحبہ اُٹھیں اور تہجد کی نماز کے بعد جن دردناک الفاظ میں اُنھوں نے دعا مانگی انکا نقل کرنا محال ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ اُنھوں نے بارگاہِ آلہی میں عرض کیا کہ "

ہمنے ایسا کیا قصور کیا ہے جسکی سزا یہ ملی ہے رمضان کے مہینے میں ہمارے گھر سینکڑوں محتاجوں کو کھانا ملتا تھا اور آج ہم خود دانے دانے کو محتاج ہیں اور روزہ پر روزہ رکھتے ہیں خداوندا اگر ہمسے قصور ہوا ہے تو اِس معصوم بچی نے کیا خطا کی جس کے مُنہ میں کل سے ایک کھیل اُڑکر نہیں گئی۔"

دوسرا دن بھی یونہی گزر گیا اور فاقہ میں روزہ پر روزہ رکھا شام کے قریب چودھری کا آدمی دودھ اور میٹھے چاول لایا اور بولا آج ہمارے نیاز تھی یہ اس کا کھانا ہے اور یہ پانچ روپیہ زکوٰۃ کے ہیں ہر سال بکریوں کی زکوٰۃ میں بکری دیا کرتے ہیں مگر اب کی نقد دیدیا ہے۔ یہ کھانا اور روپیہ مجکو ایسی نعمت معلوم ہوئے گویا بادشاہت مل گئی۔ خوشی خوشی والدہ کے آگے سارا قصہ کہا۔ کہتا جاتا تھا اور خدا کا شکرانہ بھیجا جاتا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ گردش فلاکت نے مرد کے خیال پر تو اثر ڈالدیا لیکن عورت ذات جوں کی توں اپنی قدیمی غیرت داری پر قایم ہے۔

چنانچہ میں نے دیکھا کہ والدہ کا رنگ متغیر ہوگیا۔ باوجود فاقہ کی ناتوانی کے اُٹھ بیٹھیں

تیور بدل کر کہا " تف ہے تیری غیرت پر خیرات اور زکوٰۃ لیکر آیا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ ارے اس سے مر جانا بہتر تھا اگرچہ ہم مٹ گئے مگر ہماری حرارت نہیں مٹی۔

میدان میں نکل کر مر جانا یا مار ڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے۔ صدقہ خواری ہمارا شیوہ نہیں۔

والدہ کی ان باتوں سے مجھے پسینہ آگیا اور شرم کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے چاہا کہ اٹھکر یہ چیزیں واپس کر آؤں مگر والدہ نے روکا اور کہا " خدا ہی کو یہ منظور ہے تو ہم کیا کریں سب کچھ سہنا پڑیگا " یہ کہکر کھانا رکھ لیا اور روزہ کھولنے کے بعد ہم سب نے ملکر کھا لیا پانچ روپیہ کا آٹا منگوایا گیا جس سے رمضان خیر و خوبی سے بسر ہو گیا۔

اس کے بعد چھ مہینے گاؤں میں اور رہے پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں آکر والدہ کا تو انتقال ہو گیا اور بہن کی شادی کر دی۔ انگریزی سرکار نے میری بھی پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی ہے جس پر آج کل زندگی کا انحصار ہے۔

چھٹا فسانہ

بنتِ بہادر شاہ

یہ ایک بیچاری درویشنی کی سچی بپتا ہے۔ جو زمانہ کی گردش سے ان پر گذری ان کا نام کلثوم زمانی بیگم تھا یہ دہلی کے آخری مغل بادشاہ ابو ظفر بہادر شاہ کی لاڈلی بیٹی تھیں، چند سال ہوئے ان کا انتقال ہو گیا۔ میں نے بارہا شہزادی صاحبہ سے خود ان کی زبانی ان کے حالات سُنے ہیں۔ کیونکہ ان کو ہمارے حضور خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی خانقاہ سے خاص عقیدت تھی۔ اس لئے اکثر حاضر ہوتی تھیں۔ اور مجکو انکی

دردناک باتیں سُننے کا موقع ملتا تھا۔ نیچے جسقدر واقعات لکھے گئے ہیں وہ یا تو خود ان کے بیان کردہ ہیں یا انکی صاحبزادی زینت زمانی بیگم کے جو اب تک زندہ ہیں اور پنڈت کے کوچہ میں رہتی ہیں اور وہ حالات یہ ہیں۔

جس وقت میرے بابا جان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج وتخت لٹنے کا وقت قریب آیا تو دلی کے لال قلعہ میں ایک کہرام مچا ہوا تھا در و دیوار پر حسرت برستی تھی اُجلے اُجلے سنگ مرمر کے مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے۔ تین وقت سے کسی نے کچھ نہ کھایا تھا زینت میری گود میں ڈیڑھ برس کا بچہ تھی اور دودھ کے لئے بلکتی تھی۔ فکر اور پریشانی کے مارے نہ میرے دودھ رہا تھا نہ کسی انّا کے ہم سب اسی یاس وہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ حضرت ظل سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہمکو بلانے آیا آدھی رات کا وقت سناٹے کا عالم گولوں کی گرج سے دل سہمے جاتے تھے۔ لیکن حکم سُلطانی سنتے ہی حاضری کے لئے روانہ ہو گئے۔ حضور مصلے پر تشریف رکھتے تھے تسبیح ہاتھ میں تھی۔ جب میں سامنے پہنچی جھک کر تین مجرے بجا لائی حضور نے نہایت شفقت سے قریب بلایا اور فرمانے لگے کلثوم لو اب تم کو خدا کو سونپا قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے تم اپنے خاوند کو لیکر فوراً کہیں چلی جاؤ میں بھی جاتا ہوں۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس آخری وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں پر کیا کروں ساتھ رکھنے میں تمہاری بربادی کا اندیشہ ہے الگ رہو گی تو شاید خدا کوئی بہتری کا سامان پیدا کر دے۔

اتنا فرما کر حضور نے دست مبارک دعا کے لئے بلند کئے جو رعشہ کے سبب کانپ رہے تھے دیر تک آواز سے بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے رہے۔

خداوندا یہ بے وارث بچے تیرے حوالے کرتا ہوں یہ محلوں کے رہنے والے جنگل ویرانوں میں جاتے ہیں دنیا میں ان کا کوئی یار و مددگار نہیں رہا تیمور کے نام کی عزت رکھیو اور ان بیکس عورتوں کی آبرو بچائیو پروردگار یہی نہیں

بلکہ ہندوستان کے سب ہندو مسلمان میری اولاد ہیں اور آجکل سب پر
مصیبت چھائی ہے میرے اعمال کی شامت سے انکو سوا دکر اور سبکو
پریشانیوں سے نجات دے"

اس کے بعد میرے سر پہ ہاتھ رکھا زینت کو پیار کیا اور میرے خاوند مرزا ضیاء الدین
کو کچھ جواہرات عنایت کرکے نور محل صاحبہ کو بھی ہمراہ کر دیا جو حضور کی بیگم تھیں۔

پچھلی رات کو ہمارا قافلہ قلعہ سے نکلا جس میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں مردوں
میں ایک میرے خاوند میرزا ضیاء الدین اور دوسرے مرزا عمر سلطان بادشاہ کے
بہنوئی تھے۔ عورتوں میں ایک میں دوسری نواب نور محل تیسری حافظہ سلطان بادشاہ
کی سمدھن تھیں جسوقت ہم لوگ رتھ میں سوار ہونے لگے۔ صبح صادق کا وقت تھا
تارے سب چھپ گئے تھے مگر فجر کا تارا جھلملا رہا تھا ہم نے اپنے بھرے پرے گھر
پر اور سلطانی محلوں پر آخری نظر ڈالی تو دل بھر آیا اور آنسو امنڈنے لگے۔ نواب نور محل
کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پلکیں ان کے بوجھ سے کانپ رہی تھیں اور
صبح کے تارے کا جھلملانا نور محل کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔

آخر لال قلعہ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر کورالی گاؤں میں پہنچے اور وہاں اپنے
رتھ بان کے مکان پر قیام کیا۔ با[illegible]ٹی اور چھاچھ کھانے کو میسر آئی اس وقت
بھوک میں یہ چیزیں بریانی متنجن سے [illegible]دار معلوم ہوئیں ایک دن رات
تو امن سے بسر ہوا مگر دوسرے دن گرد و نواح کے جاٹ گوجر جمع ہو کر کورالی کو
لوٹنے چڑھ آئے۔ سینکڑوں عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں جو چڑیوں کی طرح
ہم لوگوں کو چمٹ گئیں۔ تمام زیور اور کپڑے ان لوگوں نے اتار لئے جسوقت
یہ سڑی بسی عورتیں اپنے موٹے موٹے میلے ہاتھوں سے ہمارے گلے کو نوچتی تھیں
تو ان کے لہنگوں سے ایسی بو آتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔

اس لوٹ کے بعد ہمارے پاس اتنا بھی باقی نہ رہا جو ایک وقت کی روٹی کو کافی ہو سکتا۔ حیران تھے کہ دیکھئے اب اور کیا پیش آئیگا۔ زینت پیاس کے مارے رو رہی تھی۔ سامنے سے ایک زمیندار نکلا میں نے بے اختیار ہو کر آواز دی۔ بھائی تھوڑا پانی اس بچی کو لا دے۔ زمیندار فوراً ایک مٹی کے برتن میں پانی لایا اور بولا آج سے تو میری بہن اور میں تیرا بھائی۔ یہ زمیندار کورالی کا کھاتا پیتا آدمی تھا اسکا نام بستی تھا اسنے اپنی بیل گاڑی تیار کر کے ہمکو سوار کیا اور پوچھا کہ جہاں تم کہو پہنچا دوں ہم نے کہا کہ اجاڑہ ضلع میرٹھ۔ میں میر فیض علی شاہی حکیم رہتے ہیں جن سے ہمارے خاندان کے خاص مراسم ہیں وہاں لے چل۔ بستی ہمکو اجاڑہ لے گیا۔ مگر میر فیض علی نے ایسی بے مروتی کا برتاؤ کیا جسکی کوئی حد نہیں صاف کانوں پر ہاتھ رکھ لئے کہ میں تم لوگوں کو ٹھہرا کر اپنا گھر بار تباہ کرنا نہیں چاہتا۔

وہ وقت بڑا مایوسی کا تھا۔ ایک تو یہ خطرہ کہ پیچھے سے انگریزی فوج آتی ہو گی اس پر بے سر و سامانی کا یہ عالم کہ ہر شخص کی نگاہ پھری ہوئی تھی۔ وہ لوگ جو ہماری آنکھوں کے اشاروں پر چلتے اور ہر وقت دیکھتے رہتے تھے کہ ہم جو کچھ حکم دیں فوراً پورا کیا جائے وہی آج ہماری صورت سے بیزار تھے۔ شاباش ہے بستی زمیندار کو کہ اس نے زبانی بہن کہنے کو آخر تک نباہا اور ہمارا [illegible] لاچار اجاڑہ سے روانہ ہو کر [illegible] آباد کا رخ کیا۔ عورتیں بستی کی [illegible] وار تھیں اور مرد پیدل چل رہے تھے۔ تیسرے روز ایک ندی کے کنارے پہنچے۔ جہاں کوئل کے نواب کی فوج پڑی ہوئی تھی۔ انھوں نے جو سنا کہ ہم شاہی خاندان کے آدمی ہیں تو بڑی خاطر کی اور ہاتھی پر سوار کر کے ندی سے پار اتارا۔ ابھی ہم ندی کے پار اترے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی فوج آگئی اور نواب کی فوج سے لڑائی ہونے لگی۔

میرے خاوند اور مرزا عمر سلطان نے چاہا کہ نواب کی فوج میں شامل ہو کر لڑیں

مگر رسالدار نے کہلا بھیجا کہ آپ عورتوں کو لیکر جلدی چلے جایئے ہم جیسا موقع ہوگا بھگت لیں گے سامنے کھیت تھے جن میں پکی ہوئی تیار کھیتی کھڑی تھی ہم لوگ اسکے اندر چھپ گئے ظالموں نے خبر نہیں دیکھ لیا تھا یا ناگہانی طور پر گولی لگی جو کچھ بھی ہوا ایک گولی کھیت میں آئی جس سے آگ بھڑک اٹھی اور تمام کھیت جلنے لگا ہم لوگ وہاں سے نکلکر بھاگے۔ پرہائے کیسی مصیبت تھی ہمکو بھاگنا بھی نہ آتا تھا گھاس میں الجھ الجھ کر گرتے تھے سر کی چادریں وہیں رہ گئیں برہنہ سر حواس باختہ بدقت سے کھیت کے باہر آئے میرے اور نواب نور محل کے پاؤں خون ہو گئے پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل آئیں۔ زینت پر غشی کا عالم تھا۔ مرد ہمکو سنبھالتے تھے مگر ہمارا سنبھلنا مشکل تھا۔

نواب نور محل تو کھیت سے نکلتے ہی چکرا کر گر پڑیں۔ اور بیہوش ہو گئیں۔ میں زینت کو چھاتی سے لگائے اپنے خاوند کا منہ تک رہی تھی اور دل میں کہتی تھی کہ الٰہی ہم کہاں جائیں کہیں سہارا نظر نہیں آتا قسمت ایسی پلٹی کہ شاہی سے گدائی ہو گئی لیکن فقیروں کو چین و اطمینان ہوتا ہے۔ یہاں وہ بھی نصیب نہیں۔

فوج لڑتی ہوئی دور نکل گئی [illegible] ندی سے پانی لایا۔ ہم نے پیا۔ اور نواب نور محل کے چہرہ پر چھڑکا۔ نور محل [illegible] ر بولیں۔ ابھی خواب میں تمہارے بابا جان حضرت ظل سبحانی کو دیکھا ہے [illegible] زنجیر پہنے ہوئے کھڑے ہیں اور کہتے ہیں آج ہم غریبوں کیلئے یہ کانٹوں بھرا خاک کا بچھونا فرش مخمل ہے۔ نور محل گھبرا نہیں ہمت سے کام لینا تقدیر میں لکھا تھا کہ بڑھاپے میں یہ سختیاں برداشت کروں ذرا میری کلثوم کو دکھا دو جیلخانے جانے سے پہلے اسکو دیکھونگا۔"

بادشاہ کی یہ باتیں سنکر میں نے ہائے کا نعرہ مارا اور آنکھ کھل گئی۔ کلثوم کیا سچ مچ ہمارے بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑا ہوگا۔ کیا واقعی وہ قیدیوں کی طرح جیلخانے بھیجے گئے

ہونگے۔ مرزا عمر سُلطان نے اسکا جواب دیا کہ خواب وخیال ہے بادشاہ لوگ بادشاہوں کے ساتھ ایسی بدسلوکیاں نہیں کیا کرتے۔ تم گھبراؤ نہیں وہ اچھے حال میں ہونگے۔ حاسلطان باشاہ کی سمدھن بولیں۔ یہ موئے فرنگی بادشاہوں کی قدر کیا خاک جانیں گے خود اپنے بادشاہ کا سر کاٹ کر سولہ آنے کو بیچتے ہیں۔ بوا نور محل تم نے تو طوق اور زنجیر پہنے دیکھا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ بنیے بقالوں سے تو اس سے زیادہ بدسلوکی دور نہیں ہے۔ مگر میرے شوہر میرزا ضیاء الدین نے تسکین و دلاسے کی باتیں کر کے سب کو مطمئن کر دیا۔ اتنے میں بستی ناؤ میں گاڑی کو اس پار لے آیا۔ اور ہم سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ تھوڑی دور جا کر شام ہو گئی اور ہماری گاڑی ایک گاؤں میں جا کر ٹھیری جس میں مسلمان راجپوتوں کی آبادی تھی۔ گاؤں کے نمبردار نے ایک چھپر ہمارے واسطے خالی کرا دیا جس میں سوکھی گھاس اور پھوس کا بچھونا تھا۔ وہ لوگ اسی گھاس پر جسکو پیال یا پرال کہتے تھے سوتے ہیں۔ ہمکو بھی بڑی خاطر داری سے (جو اُنکے خیال میں بڑی خاطر تھی) یہ نرم بچھونا دیا گیا۔ میرا تو اس کوڑے سے جی اُلجھنے لگا۔ پر کیا کرتے اس وقت سوائے اسکے اور کیا ہو سکتا تھا ناچار اسی میں پڑ رہے۔ دن بھر کی تکلیف اور تکان کے بعد اطمینان اور بے فکری میسر آئی تھی نیند آ گئی۔ آدھی رات کو ا[illegible] کی آنکھ کھل گئی گھاس کے تنکے سوئیوں کی طرح بدن میں چبھ رہے تھے اور پسو [illegible] رہے تھے۔ اس وقت کی بیکلی بھی خدا کی پناہ پسوؤں نے تمام بدن میں آگ لگا دی تھی۔ مخملی تکیوں۔ ریشمی نرم نرم بچھونوں کی عادت تھی۔ اس لئے تکلیف ہوئی ورنہ ہم ہی جیسے وہ گاؤں کے آدمی بھی تھے جو بے غل غش اسی گھاس پر پڑے سوتے تھے اندھیری رات میں چاروں طرف گیدڑوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور میرا دل سہما جاتا تھا۔ قسمت کو پلٹتے دیر نہیں لگتی کون کہہ سکتا تھا کہ ایک دن شہنشاہ ہند کے بال بچے یوں خاک پر بسیرے لیتے پھرینگے۔ قصہ مختصر اسی طرح منزل بمنزل تقدیر کی گردشوں کا تماشہ دیکھتے ہوئے حیدر آباد پہنچے اور سیتا رام پیٹھ میں ایک مکان کرایہ کو لیکر

ٹھہرے جبل پور میں میرے شوہر نے ایک جڑاؤ انگوٹھی جو لوٹ کھسوٹ سے بچ گئی تھی فروخت کی
اسی میں راستہ کا خرچ چلا اور چند روز یہاں بھی بسر ہوئے آخر تابہ کے جو کچھ تھا ختم ہو گیا
اب فکر ہوئی کہ پیٹ بھرنے کا کیا حیلہ کیا جائے میرے شوہر اعلیٰ درجے کے خوشنویس
تھے۔ اُنھوں نے درود شریف خط ریحان میں لکھا اور چار مینار پر ہدیہ کرنے لگے لوگ
اس خط کو دیکھتے تھے اور حیرت میں رہتے تھے۔ اوّل روز پانچ روپیہ کو درود شریف
ہدیہ ہوا اس کے بعد یہ قاعدہ ہوا کہ جو کچھ لکھتے کمتی بڑھتی فوراً بک جاتا اس طرح ہماری
گزر اوقات بہت عمدگی سے ہونے لگی لیکن موسیٰ ندی کے چڑھاؤ سے ڈر کر شہر میں داروغہ
احمد کے مکان میں اُٹھ آئے یہ شخص حضور نظام کا خاص ملازم تھا اسکے بہت سے مکان کرایہ
پہ چلتے تھے۔

چند روز بعد خبر اُڑی کہ نواب لشکر جنگ جس نے شہزادوں کو اپنے یاں پناہ دی تھی
انگریزوں کے عتاب میں آگیا ہے اور اب کوئی شخص دہلی کے شہزادوں کو پناہ نہیں دیگا
بلکہ جس کسی شہزادے کی خبر ملے گی اس کو گرفتار کرانے کی کوشش کریگا ہم سب اس خبر سے
گھبرا گئے اور میں نے اپنے شوہر کو باہر نکلنے سے روک دیا کہ کہیں کوئی دشمن پکڑوا نہ دے
گھر میں بیٹھے بیٹھے فاقوں کی نوبت آگئی تو ناچار ایک نواب کے لڑکے کو قرآن پڑھانے کی
نوکری میرے شوہر نے بارہ روپیہ ماہوار پر کرلی چپ چاپ اُسکے گھر چلے جاتے اور
پڑھا کر آجاتے۔ مگر وہ نواب اسقدر بد مزاج تھا کہ ہمیشہ معمولی نوکروں کی طرح میرے
شوہر کے ساتھ برتاؤ کرتا تھا جس کی برداشت وہ نہ کر سکتے تھے اور گھر میں آکر رو رو کر دعا
مانگتے کہ الٰہی اس ذلت کی نوکری سے تو موت لاکھ درجہ بڑھ کر ہے تو نے اتنا محتاج بنا دیا
کل تو اس نواب جیسے سینکڑوں ہمارے غلام تھے اور آج ہم اسکے غلام ہیں۔ اسی اثنا میں
کسی نے میاں نظام الدین صاحب کو ہماری خبر کردی۔ میاں کی حیدر آباد میں بڑی عزت
تھی کیونکہ میاں حضرت کالے میاں صاحب چشتی نظامی فخری کے صاحبزادے تھے جنکو بادشاہ دہلی

اور نظام اپنا پیر تصور کرتے تھے۔ میاں رات کے وقت میانہ میں سوار ہو کر ہمارے پاس تشریف لائے اور ہمکو دیکھکر بہت روئے ایک زمانہ تھا جب وہ قلعہ میں تشریف لاتے تھے تو مسند زرنگار پر بٹھائے جاتے تھے بادشاہ بیگم اپنے ہاتھ سے لونڈیوں کی طرح مگس رانی کرتی تھی آج وہ گھر میں آئے تو ثابت بوریا بھی نہ تھا جس پر وہ آرام سے بیٹھ جاتے پچھلا زمانہ آنکھوں میں پھرنے لگا خدا کی شان کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ میاں بہت دیر تک حالات دریافت فرماتے رہے اسکے بعد تشریف لے گئے۔ صبح کو پیام آیا کہ ہمنے خرچ کا انتظام کر دیا ہے اب تم حج کا ارادہ کر لو۔ یہ سنکر جی باغ باغ ہو گیا اور مکہ معظمہ کی تیاریاں ہونے لگیں نقیبہ حیدر آباد سے روانہ ہو کر بمبئی آئے اور یہاں اپنے بچے رفیق بستی کو خرچ دیکر اسکے گھر رخصت کر دیا۔ جہاز میں سوار ہوئے جو مسافر یہ سنتا تھا کہ ہم شاہ ہند کے گھرانے کے ہیں تو ہمارے دیکھنے کا شوق ظاہر کرتا تھا۔ اس وقت ہم سب دُرویشانہ رنگین لباس میں تھے ایک ہندو نے جس کی شاید عدن میں دوکان تھی اور جو ہمارے حال سے بیخبر تھا پوچھا کہ تم لوگ کس پنتھ کے فقیر ہو اُس کے اس سوال نے زخمی دل کو چھیڑ دیا، میں بولی:۔

"ہم مظلوم شاہ گُرو کے چیلے ہیں وہی ہمارا باپ تھا اور وہی ہمارا گُرو، پاپی لوگوں نے اُسکا گھر بار چھین لیا اور ہمکو اُس سے جدا کر کے جنگلوں میں نکال دیا اب وہ ہماری صورت کو ترستا ہے اور ہم اُس کے درشنوں بغیر بے چین ہیں۔"

اس سے زیادہ اور کیا اپنی فقیری کی حالت بیان کریں۔ جب اُس نے ہماری اصلی کیفیت لوگوں سے سُنی تو بچارا رونے لگا اور بولا بہادر شاہ ہم سب کا باپ اور گُرو تھا کرم رام جی کی یہی مرضی تھی کہ وہ بیگناہ برباد ہو گیا

مکہ پہنچے تو اللہ میاں نے ٹھیرنے کا ایک عجیب ٹھکانا پیدا کر دیا۔ عبد القادر نامی میرا ایک غلام تھا جس کو مینے آزاد کر کے مکہ بھیج دیا تھا یہاں آ کر اس نے بڑی دولت کمائی اور زمزم کا داروغہ ہو گیا۔ اسکو جو ہمارے آنے کی خبر ملی دوڑا ہوا آیا اور قدموں پر گر کر خوب رویا اس کا مکان بہت اچھا اور آرام کا تھا ہم سب دے میں ٹھہر گئے چند روز بعد

سلطانِ روم کے نائب کو جو مکہ میں رہتا ہے۔ ہماری خبر ہوئی۔ تو وہ بھی ہم سے ملنے
آیا کسی نے اس سے کہا تھا کہ شاہ دہلی کی لڑکی آئی رہے جو بے حجابانہ باتیں کرتی ہے
نائب سلطان نے عبدالقادر کے ذریعہ سے ملاقات کا پیام دیا جو میں نے منظور کیا دوسرے
دن وہ ہمارے گھر پر آیا اور نہایت ادب قاعدہ سے بات چیت کی آخر میں اُس نے
خواہش کی کہ میں آپ کے آنے کی اطلاع حضور سُلطان کو دینی چاہتا ہوں۔ میں نے اسکا
جواب بہت بے پروائی سے دیا کہ اب ہم ایک بڑے سُلطان کے دربار میں آگئے ہیں اب
ہمیں کسی دوسرے سُلطان کی پرواہ نہیں ہے نائب نے ایک معقول رقم ہمارے
اخراجات کے لئے مقرر کر دی اور ہم نو برس وہاں مقیم رہے اس کے بعد ایک سال
بغداد شریف ایک سال نجف اشرف وکربلائے معلےٰ میں بسر ہوا اتنی مدت کے بعد
دہلی کی یاد نے بےچین کیا اور روانہ ہو کر دہلی آگئے یہاں انگریزوں کی سرکار نے
بہت بڑا ترس کھا کر دس روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی ہے اس پنشن کی رقم کو سنکر
اوّل تو مجھے ہنسی آئی کہ میرے باپ کا اتنا بڑا ملک لیکر دس روپیہ معاوضہ دیتے ہیں
مگر پھر خیال آیا کہ ملک تو خدا کا ہے کسی کے باوا کا نہیں ہے وہ جسکو چاہتا ہے دے دیتا
ہے جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے انسان کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔

ساتواں فسانہ

یتیم شہزادہ کی عید

۱۳۲۳ھ کی عید الفطر کا ذکر ہے دہلی میں ۲۹ کا چاند نظر آیا۔ درزی خوش تھے
کہ ان کو ایک دن کام کرنے کو مل گیا۔ جوتے والوں کو بھی خوشی تھی کہ ایک روز کی کمائی

بڑھ گئی۔

مگر مسلمانوں کے ایک غریب محلہ میں تیموریہ خاندان کا ایک گھرانہ اس دن بہت غمگین تھا یہ لوگ عصر سے پہلے اپنے گھر کے وارث میرزا دلدار شاہ کو دفن کرکے آئے تھے۔

دلدار شاہ دس دن سے بیمار تھے ان کو پانچ روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی۔ گھر میں ان کی بیوی اور یہ خود کناری بنتے تھے جس میں ان کو اتنی معقول آمدنی تھی کہ خوب آرام سے بسر اوقات کرتے تھے۔

ان کے چار بچے تھے۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا دو لڑکیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں ایک ڈیڑھ سال کی گود میں تھی اور ایک لڑکا دس برس کا تھا۔

دلدار شاہ اس لڑکے کو بہت چاہتے تھے بیگم نے بہت چاہا کہ لڑکا مکتب میں جائے مگر دلدار شاہ کو بچہ اسقدر لاڈلا تھا کہ اُنھوں نے ایک دن اُسکو مکتب نہ بھیجا۔

لڑکا سارا دن گلیوں میں آوارہ پھرتا تھا۔ زبان پر گالیاں اسقدر چڑھ گئی تھیں کہ بات بات میں مغلظات بکتا تھا۔ اور باوا جان اس کی بھولی بھولی باتوں سے خوش ہوتے تھے

میرزا دلدار شاہ بہادر شاہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ مرتے وقت انکی عمر ۶۵ برس کی ہو گی۔ کیونکہ جب یہ لڑکا ان کے ہاں پیدا ہوا ہے تو انکی عمر ۵۵ برس کی تھی۔

بڑھاپے کی اولاد سب کو پیاری ہوتی ہے۔ خاصکر بیٹا۔ میرزا دلدار شاہ جتنی محبت کرتے تھوڑی تھی۔

ایک دن ان کے دوست نے کہا۔ صاحب عالم بچہ کے لکھنے پڑھنے کی یہی عمر ہے اب نہ پڑھے گا تو کب پڑھیگا۔ لاڈ پیار بھی ایک حد تک اچھا ہوتا ہے آپ اس کے حق میں کانٹے بوتے ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ایک دن سب کو مرنا ہے خدانخواستہ آپکی آنکھیں بند ہو گئیں تو اس معصوم کا کہیں ٹھکانہ نہیں رہیگا لکھ پڑھ لیگا تو دو روٹیاں کما کھائیگا اس زمانہ میں شریفوں

کی گزران بڑی دشوار ہوگئی ہے کچھ آئندہ کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اسکو غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑے۔ اور بزرگوں کی ناک کٹے۔

مرزا دلدار شاہ اس ہمدردی سے بگڑ گئے اور بولے آپ میرے مرنے کی بدشگونی کرتے ہیں ابھی میری کونسی ایسی عمر ہوگئی ہے۔ لوگ تو سو برس تک زندہ رہتے ہیں رہا بچہ کا پڑھانا سو میرے نزدیک تو اسکی کوئی ضرورت نہیں۔ بڑے بڑے، بی۔ اے پاس مارے مارے پھرتے ہیں اور دو کوڑی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ میرا بچہ پہلے ہی دہان پان ہے۔ آئے دن کا مرضین ہے۔ میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ ظالم اُستادوں کے حوالے کرکے اسکی نازک ہڈیوں کو قمچیوں کا نشانہ بناؤں۔ جب تک میرے، دم میں دم ہے عیش کراؤنگا میں نہ رہونگا تو خدا رازق ہے وہ چیونٹی تک کو کھانا دیتا ہے۔ پتھر کے کیڑے کو رزق پہنچاتا ہے آدمی کے بچّہ کو کہیں بھوکا ماریگا۔ میاں ہمنے زمانہ کا بڑا گرم سرد رنگ دیکھا ہے ہمارے ماں باپ نے بھی ہمکو نہ پڑھایا تو کیا ہم بھوکے مرتے ہیں۔

نصیحت کرنے والے بچارے یہ جواب سُنکر چُپ ہو گئے اور دل ہی دل میں پچتائے کہ ناحق ان سے دردمندی کی بات کہی۔ لیکن اُنھیں خیال آیا کہ حق بات کہنے سے چپکا رہنا گناہ ہے الساکت عن الحق شیطان اخرس سچی بات کہنے سے خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے۔ اسلئے اُنھوں نے پھر کہا کہ جناب آپ ناراض نہ ہوں میں خدانخواستہ آپکا مرنا نہیں چاہتا۔ میں نے تو دوراندیشی کی بات کہی تھی آپ کو ناگوار گذری تو معاف فرمائیے۔ مگر یہ تو خیال فرمالیجئے کہ آپ کے بچپن میں اور حالت تھی اور آج کل اور زمانہ ہے اُس وقت قلعہ آباد تھا۔ جہاں پناہ ظل سبحانی بہادر شاہ حضرت کا سایہ سر پر تھا ہر بات سے بیفکری تھی لیکن آج تو کچھ بھی نہیں نہ بادشاہی ہے نہ امیری ہے ہر مسلمان کے گھر میں گدائی اور فقیری ہے اب تو جو ہنرمندی سیکھے گا اور اپنی روٹی اپنے بازو سے کمائیگا وہی لال و نکالال بنے گا ورنہ ذلت و خواری کے سوا

کچھ نہ ہاتھ آئیگا۔

دلدار شاہ نے کہا ہاں یہ سچ ہے میں سکو سمجھتا ہوں۔ مگر آخر ہماری بھی تو اتنی عمر اسی بربادی کے زمانہ میں بسر ہوگئی۔ سرکار نے پانچ روپیہ کی جو پنشن مقرر کی ہے تم جانتے ہو کہ اسمیں ہمارے کیسے وقت نکلتے ہونگے۔ آٹھ آنے روز تو بچہ کا خرچ ہے ہم دونوں میاں بیوی روپیہ ڈیڑھ روپیہ کی روز کناری بنتے ہیں اور مزے سے گذر اوقات کرتے ہیں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک تیسرے صاحب تشریف لائے اور اُنھوں نے کہا آشٹریا کے بادشاہ کا ولیعہد مارا گیا جب بادشاہ کو اسکی خبر پہنچی تو وہ بے قرار ہوگیا اور ہائے کا نعرہ مار کر کہا ظالموں نے سب کچھ لوٹ لیا میرے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا۔

میرزا دلدار شاہ یہ سنکر ہنسنے لگے۔ اور بولے بھئی واہ اچھی بہادری ہے بیٹے کے ناگہانی مرنے سے ایسے گھبرا گئے میاں جب بہادر شاہ حضرت کے صاحبزادے میرزا مغل وغیرہ گولی سے مارے گئے اور اُن کے سر کاٹ کر سامنے لائے تو بادشاہ نے خوان میں کٹے ہوئے سر دیکھکر نہایت بے پروائی سے فرمایا الحمد للہ سرخرو ہو کر سامنے آئے مرد لوگ اسی دن کے لئے بچے پالتے ہیں۔

جو صاحب خبر لائے تھے وہ بولے کیوں جناب غدر میں آپکی کیا عمر ہوگی میرزا دلدار شاہ نے کہا کوئی چودہ پندرہ برس کی مجھے سب واقعات اچھی طرح یاد ہیں باوا جان ہمکو لیکر غازی آباد جا رہے تھے کہ ہنڈن ندی پر ہمکو فوج نے پکڑ لیا۔ والدہ اور میری چھوٹی بہن چیخیں مار کر رونے لگیں والد نے ان کو منع کیا اور آنکھ بچا کر ایک سپاہی کی تلوار اُٹھالی۔ تلوار ہاتھ میں لینی تھی کہ سپاہی چاروں طرف سے ان پر ٹوٹ پڑے انہوں نے دو چار کو زخمی کیا۔ مگر سنگینوں اور تلواروں کے اتنے وار ان پر ہوئے کہ بچارے قیمہ قیمہ ہو کر گر پڑے اور شہید ہو گئے۔

اِن کی شہادت کے بعد سپاہیوں نے میری بہن اور ماں کے کانوں کو نوچ لیا اور

جو کچھ ان کے پاس تھا چھین کر چلتے ہوئے مجھ کو انھوں نے قید کرکے ساتھ لے لیا۔

جس وقت میں والدہ سے جدا ہوا ہوں انکی آہ وزاری سے آسمان ہلا جلاتا تھا وہ کلیجہ کو تھامے ہوئے چیخی تھیں اور کہتی تھیں۔

ارے میرے لال کو چھوڑ دو تم نے میرے سرتاج کو خاک میں سلادیا اس یتیم پر تو رحم کرو میں رنڈیا کس کے سہارے رنڈاپا کاٹوں گی۔ اللہ میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ میرا دلدار کہاں جاتا ہے کوئی اکبر و شاہجہاں کو قبر سے بلائے ان کے گھرانے کی دکھیا کی بپتا سنائے۔ دیکھو میرے دل کے ٹکڑے کو مٹھی میں مسلے دیتے ہیں۔ ارے کوئی آؤ میری گود لیوکا پالا مجکو دلواؤ۔

چھوٹی بہن آکا بھائی۔ آکا بھائی کہتی ہوئی میری طرف دوڑی۔ مگر سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیئے اور مجھ کو باگ ڈورسے باندھ لیا گھوڑے دوڑتے تھے تو میں بھی دوڑتا تھا پاؤں لہولہان ہو گئے تھے دل دھڑکتا تھا دم اکھڑا جاتا تھا۔

پوچھا میرزا یہ بات رہ گئی کہ پھر تمہاری والدہ اور بہن کا کیا حال ہوا۔

میرزا نے کہا آج تک انکا پتہ نہیں لگا۔ خبر نہیں ان پر کیا گزری اور وہ کہاں گئیں مجھ کو سپاہی اپنے ہمراہ دہلی لائے اور یہاں سے اندور لیگئے مجھ سے گھوڑے ملواتے تھے اور گھوڑوں کی لید صاف کراتے تھے۔

چند روز بعد مجکو چھوڑ دیا گیا اور میں نے اندور میں ایک ٹھاکر کے ہاں دربانی کی نوکری کرلی۔ کئی برس اس میں گزارے۔ پھر دہلی میں آیا اور سرکار میں درخواست دی اس کی مہربانی سے میری بھی اوروں کی طرح پانچروپیہ ماہوار پنشن مقرر ہو گئی اسکے بعد میں نے شادی کی یہ بچے پیدا ہوئے اس واقعہ کے بعد میرزا دلدار شاہ بیمار ہوئے اور دس دن بیمار رہ کر آخرت کو سدھارے۔

اِن کے مرنے کا غم سب سے زیادہ انکی بیوی اور لڑکے کو تھا۔ لڑکا دس برس کا تھا اور اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ابّا جان مر گئے ہیں مگر وہ بار بار امّاں سے کہتا تھا کہ ابّا جان کو بلا دو۔ الغرض اِس رونے دھونے میں یہ سب لوگ سو گئے۔ سحری کو بیگم صاحبہ بیدار ہوئیں تو دیکھا کہ گھر میں جھاڑو پھری ہوئی ہے کپڑا لتّا۔ برتن بھانڈا سب چور لے گئے۔ بیچاری بیوہ نے سر پیٹ لیا۔ ہے ہے اب میں کیا کرونگی میرے پاس تو ایک تنکا بھی نہ رہا گھر کے مالک کے اُٹھتے ہی چوری بھی ہوئی۔

آس پاس کے محلہ والے اِن کے رونے کی آواز سُنکر جمع ہو گئے اور سب نے بہت افسوس کیا پڑوس میں ایک گوٹے والے رہتے تھے اُنھوں نے سحری کے لئے دودھ اور نان پاؤ بھیجا۔ اور بیچاری نے ٹھنڈا سانس بھر کے اسکو لے لیا۔

یہ پہلا دن تھا کہ بیوہ شہزادی نے خیرات کی سحری کھائی جس کا اِس کو سب سے زیادہ صدمہ تھا۔ دن ہوا چاروں طرف عید کے سامان نظر آتے تھے چاندرات کی چہل پہل ہر گھر میں تھی مگر نہ تھی تو اِس گھر میں جہاں دودھ پیتی بچی کو گود میں لئے بیوہ شہزادی یتیم شہزادہ کو سمجھا رہی تھی۔ کیونکہ وہ نئی جوتی اور نئے کپڑے مانگتا تھا۔ ماں نے کہا

"بیٹا تمہارے ابّا جان پردیس گئے ہیں وہ آجائیں تو کپڑے منگا دیں گے۔ دیکھو تمہارے دولہا بھائی بھی بنارس گئے ہوئے ہیں وہ ہوتے تو اُن سے ہی منگا دیتے۔ اب کس کو بازار بھیجوں۔"

لڑکے نے کہا میں خود لے آؤنگا مجھکو دام دو۔ دام کا نام سُنکر دکھیاری بیوہ کے آنسو آگئے اِس نے کہا تمہیں خبر نہیں رات کو گھر میں چوری ہو گئی ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔

ضدی شہزادہ نے مچل کر کہا نہیں میں تو ابھی لونگا۔ یہ کہکر دو چار گالیاں ماں کو دیں مصیبت زدہ نے ٹھنڈا سانس بھر کر آسمان کو دیکھا اور بولی اچھا ٹھہر و میں منگاتی ہوں

یہ کہکر پڑوس کے گھر سے لگی ہوئی کھڑکی میں جا کر کھڑی ہوئی اور گوٹے والے کی بیوی سے کہا۔ بوا عدت کے دن ہیں میں اندر تو نہیں آسکتی ذرا میری بات سُن جاؤ وہ بیچاری فوراً اس کے پاس آئی تو اُسے سارا ماجرا سُنایا اور کہا خدا واسطہ کا کام ہے اپنے بچے کی اُترن کوئی جوتی یا کپڑوں کا جوڑا ہو تو ایک دن کے لئے مانگے دیدو کل شام کو واپس دیدوں گی۔

شہزادی اُترن کہتے وقت بے اختیار ہچکی لے کر رونے لگی۔ پڑوسن کو ترس آیا اس نے کہا بُوا رونے اور جی بھاری کرنے کی کچھ بات نہیں ننھے کی کئی جوتیاں اور کئی جوڑے فالتو رکھے ہیں ایک تم لے لو۔ اس میں اُترن کا خیال نہ کرو اس نے تو ایک دن یونہی ذرا پاؤں میں ڈالی تھی میں نے سنگوا کر رکھدی۔

یہ کہکر پڑوسن نے جوتی اور کپڑے شہزادی کو دیئے۔ شہزادی یہ چیزیں لیکر بچے کے پاس آئی اور اس کو یہ سب دکھائیں بچہ خوش ہو گیا۔

دوسرے دن عیدگاہ جانے کے لئے شہزادی نے اپنے بچہ کو بھی گوٹہ والے پڑوسی کے ساتھ کر دیا۔ عیدگاہ پہنچکر یتیم شہزادے نے گوٹہ والے کے لڑکے سے کہا کہ تیری ٹوپی سے ہماری ٹوپی اچھی ہے گوٹہ والے کے لڑکے نے جواب دیا۔

چل بے اُترن کتھرن پر اتراتا ہے۔ ابے یہ بھی میری ٹوپی ہے اماں نے خیر خیرات دیدی ہے یہ سُننا تھا کہ شہزادہ نے ایک زور کا تھپڑ گوٹہ والے کے بچہ کے مارا اور ہم کو خیرات خورہ کہتا ہے۔

گوٹہ والے نے جو اپنے بچہ کو پِٹتا دیکھا تو اس کو بھی غصہ آگیا اور اس نے دو تین طمانچے شہزادے کے مارے۔ یہ لڑکا روتا دھوتا بھاگا گوٹہ والے نے خیال کیا کہ اسکی ماں کیا کہے گی کہ ساتھ لے گئے تھے کہاں چھوڑ آئے اسلئے وہ اس کے پکڑنے کو دوڑا مگر لڑکا نظروں سے غائب ہو گیا ناچار گوٹہ والہ مجبور ہو کر اپنے گھر چلا آیا۔

اب شہزادہ کی یہ کیفیت ہوئی کہ عام خلقت کے ساتھ عیدگاہ سے گھر کی طرف آرہا تھا کہ راستہ میں ایک گاڑی کی جھپٹ میں آکر گر پڑا اور زخمی ہوگیا پولس شفاخانہ لے گئی۔

یہاں گھر میں اس کی ماں کا عجب حال تھا غش پہ غش آتے تھے دو وقت سے بھوکی تھی اس پر عید اور یہ مصیبت کہ لڑکا گم ہوگیا اور عالم یہ کہ کوئی پرسان حال نہیں جو لڑکے کو تلاش کرنے جائے آخر وہی بچارا گوٹہ والا پھر گیا اور پولس میں اطلاع لکھوائی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ شفاخانہ میں ہے۔ شفاخانہ جاکر خبر لایا اور شہزادی کو ساری کیفیت سُنائی۔ اس وقت عجیب عالم تھا۔

عید کی شام تھی گھر گھر خوشیاں منائی جارہی تھیں مبارکبادوں کے چرچے تھے تحفے تحائف اور عیدیاں تقسیم ہو رہی تھیں ہر مسلمان نے اپنی حیثیت سے زیادہ گھر کو آراستہ کیا تھا اور اپنے بال بچوں کو خوش و خرم لئے بیٹھا تھا مگر بیچاری بیوہ شہزادی دو وقت کے فاقہ سے رنجور بچہ کے غم میں اشکبار اندھیرے اُجاڑ گھر میں بیٹھی آسمان کو دیکھتی تھی اور کہتی تھی " خدایا میری عید کہاں ہے" اور بے اختیار ہچکیاں لیکر روتی تھی۔ ادھر شفاخانہ میں یتیم شہزادہ ماں کی جُدائی میں پھڑکتا تھا۔

آٹھواں فسانہ

غدر کے مارے پیرجی گھسیارے

حضرت دین علی شاہ قلندر دہلی کے نامی بزرگ تھے فراشخانہ کے باہر انکا تکیہ

اب تک مشہور رہے میں غدر سے پہلے عالم شباب میں سرشاران کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

مجھ کو اپنی پیرزادگی کے گھمنڈ کے ساتھ روپیہ کا غرور تھا صورت شکل کا تکبر تھا اور اپنے زور و قوت پر بہت اکڑتا تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا ابا سے زیادہ اماں کو مجھ پر پیار تھا۔ والد خاص بازار میں رہتے تھے اور ان کے ہزارہا مرید تھے شہزادے شہزادیاں ہر وقت انکے پاس آتی تھیں نذر نیاز کا کچھ اندازہ نہ تھا غرض ہم بے تکان مزے اُڑاتے تھے۔ مگر ابا جان کا یہ عالم تھا کہ وہ باوجود اتنی کثیر آمدنی کے ہمیشہ نگینہ سازی کرکے گذرا وقات کرتے تھے۔ مریدوں کے روپیہ کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔

ایک دن میں نے والدہ سے پوچھا کیوں بی۔ یہ ابا جی گھر میں سب کچھ ہوتے سلتے نگینے کیوں گھسا کرتے ہیں۔ بڑی بے عزتی کی بات ہے خدا نے سب کچھ دیا ہے پھر خواہ مخواہ پاپڑ بیلتے ہیں۔

اماں جان نے ہنس کر کہا۔ بیٹا ان کا عقیدہ ہے کہ فقیر وہی کامل ہے جو اپنی روٹی اپنے ہاتھ سے کمائے دوسروں کے سہارے پر ہاتھ پاؤں توڑ کر نہ بیٹھے۔ انکا کہنا ہے کہ امیر مریدوں سے جو ملے وہ غریب مریدوں کا حصہ ہے ہمارا نہیں ہے ہم کو اپنی معاش خود حاصل کرنی چاہیئے۔ میں نے کہا تو کیا مریدوں کی نذر نیاز حرام ہے جو وہ نہیں کھاتے اماں نے کہا نہیں حرام تو نہیں مگر وہ ہمارا حق نہیں ہے دوسروں کا حصہ ہے۔ خدا تعالٰے یہ فتوحات اس لئے بھیجتا ہے کہ ہم اپنے محتاج بھائیوں کی خبر گیری کریں اور خود جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں اپنی روٹی آپ کمائیں

دُردانہ چھوکری

اس گفتگو کے تیسرے دن نواب زینت محل صاحبہ بیگم خاص حضور جہاں پناہ

محمد بہادر شاہ ابا کی خدمت میں آئیں۔ اِنکے ہمراہ ایک پیش خدمت دردانہ نامی تھی جونہی اِس پر میری نگاہ پڑی دل میں ایک تیر سا لگا۔ اِس نے بھی مجکو ایک شوقیہ نظر سے دیکھا مگر دونوں بے بس تھے بات نہ کر سکتے تھے۔

بیگم صاحبہ نے کئی بار دُردانہ کہکر پکارا تو نام بھی معلوم ہوا ورنہ شاید اِس کا موقع ملنا بھی محال تھا کہ میں خود چھوکری کا نام پوچھتا۔

بیگم صاحبہ چلی گئیں۔ میرا حال غیر ہونا شروع ہوا دورات بالکل نیند نہ آئی روٹی تک چھوٹ گئی۔ ہر چند سوچا کہ دردانہ سے ملنے کی صورت نکلے مگر کوئی شکل سمجھ میں آتی تھی۔ آخر جب بے قراری حد سے بڑھی تو حسب معمول حضرت دین علی شاہ قلندر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ساری بپتا انکی خدمت میں عرض کی اُنھوں نے تبسم فرمایا اور چپکے ہو گئے دوبارہ سوال کی جراءت نہ ہوئی نامراد گھر کو واپس چلا۔ راستہ میں حسینی پتنگ باز ملا جو میرا بڑا یار غار تھا۔ اِس نے جو اُتری ہوئی شکل دیکھی گھبرا کر پوچھنے لگا۔ کہو دوست خیر تو ہے۔ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں اور آنکھوں میں حلقے کاہے سے پڑ گئے ہیں مینے کہا بھائی دردانہ نامی چھوکری کی محبت سر پر سوار ہے۔ یہ عجیب قسم کا نیا آزار ہے میں تو اِس کوچہ سے واقف بھی نہ تھا۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے تقدیر اِس ناشاد جوانی کے ہاتھوں کیسی کیسی رسوائیاں دکھاتی ہے۔ دردانہ کو ملواتی ہے یا ہمکو جان ہار دنیا سے قبرستان بھجواتی ہے۔

حسینی بولا بھئی یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے نصیبن کہاری کی معرفت دردانہ سے مِل لو یہ کہاری محل میں آتی جاتی ہے جو کہو گے دردانہ تک پہنچا دیگی۔

حسینی نے ایسی تجویز بتائی کہ میرے دل کا کانٹا نکل گیا۔ سید ہا گھوسیوں کے محلہ میں گیا جہاں وہ کہاری رہتی تھی اور کچھ دیکر اسکو پیام رسانی پر راضی کر لیا۔

دوسرے دن وہ کہاری میرے پاس آئی اور دردانہ کا یہ پیام لائی کہ میرا ملنا دشوار

ہے جب تک کہ تم کوئی حیلہ نہ کرو اور وہ یہ ہونا چاہیئے کہ شہر کے باہر کہیں چلہ کرنے بیٹھو میں بیگم صاحبہ کو لیکر وہاں آؤنگی اور پھر ہمیشہ کی آمد و رفت کے موقعے نکال لونگی۔

دردانہ کی یہ بات میرے ذہن میں آگئی۔ سیدھا اماں کے پاس گیا اور کہا۔

"لو بی تم ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ باپ کے ورثہ کا خیال نہیں۔ نہ ذکر ہے نہ شغل ہے نہ نماز ہے نہ روزہ ہے یہی دن کچھ حاصل کرنے کے ہیں کچھ سیکھنا ہے تو آج سیکھ لو کل خدانخواستہ آبا کی آنکھیں بند ہوئیں تو یہ دولت دوسرے الفتوں کے پاس چلی جائے گی اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔ پس آج میں تمہارے ارشاد کی تعمیل کو حاضر ہوں۔ آبا سے کہو کہ مجھے کچھ بتائیں میں حضرت دین علی شاہ کے تکیہ کے پاس چلہ کرونگا۔

اماں نے کہا نہ میاں مجھے جنگل میں رکھنا منظور نہیں کچھ کرنا ہے تو گھر میں کرو۔ یہ بندی ایک آن تم کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیگی۔

میں نے ہر چند سمجھایا مگر اماں کے خیال میں نہ آیا۔ آخر ابا کو اس قصہ کی خبر ہوئی وہ میرے ارادہ سے بہت خوش ہوئے اور اماں کو راضی کرکے چند خفی و جہر اذکار تعلیم فرما کے تکیہ میں بھیجدیا۔ دونوں وقت گھر سے نوکر جاتا کھانا دے آتا خیر سلا لے آتا۔ اور ہم بے غل و غش اپنے کام میں مصروف رہتے۔

دو جاسوس

چوتھے پانچویں دن کا ذکر ہے میں رات کے وقت بیٹھا وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں دو اجنبی آدمی میرے حجرے میں آئے وہ دریدہ اور کہنہ لباس میں تھے میں نے اشارہ سے کہا کون ہو۔ بولے مسافر ہیں مجھ کو کچھ شک ہوا کہ یہ چور نہ ہوں وظیفہ چھوڑ کر پوچھا یہاں آنے کی کیا غرض ہے بولے آپ سے تعویذ لینے آئے میں دُردانہ بیوی نے آپ کا پتہ بتایا تھا

دُردانہ کا نام سُنکر جان میں جان آگئی۔ رات کا وقت تھا چراغ ٹمٹما رہا تھا میں ان مسافروں کی شکلیں پہچان نہ سکا۔ دل ہی دل میں سوال کر رہا تھا کہ یہ مسافر کون ہیں جو دُردانہ کو بھی جانتے ہیں۔

آخر میں نے کہا۔ آپ دُردانہ کو کیونکر پہچانتے ہیں۔ مسافر بولے بیگم صاحبہ سے خرچ راہ مانگنے گئے تھے۔ وہاں ان سے ملاقات ہوئی بہت ملنسار اور نیک بیوی ہیں میں نے کہا تم کس بات کا تعویذ چاہتے ہو۔ اُنھوں نے کہا تسخیر کا۔ پوچھا کس کے لئے۔ ہنسکر بولے شہزادہ جواں بخت کے واسطے۔

اب میری حیرت حد سے بڑھ گئی۔ شہزادہ جواں بخت زینت محل کے لاڈلے لڑکے تھے۔ انگریزوں نے میرزا دارا بخت کے مرنے کے بعد میرزا فخرو کو ولیعہد کیا تھا اور زینت محل اس کوشش میں تھیں کہ جواں بخت صاحب تاج ہو۔

میں نے کہا تو جواں بخت کو کس کی تسخیر مطلوب ہے۔ یہ سُنکر مسافروں نے تمنچے نکال لئے اور میری طرف اُن کا مُنہ کر کے بولے خبردار بھید کسی سے نہ کہنا ہم جواں بخت کے جاسوس ہیں۔ تم سے یہ کام ہے کہ تمہارے والد کے پاس جو خفیہ کاغذات شاہ عالم کے ہیں اور جن میں شاہی دفینوں کا حال ہے وہ ہم کو لا دو اگر تم نے اس کی تعمیل کا اقرار نہ کیا تو ابھی کام تمام کر دیں گے۔

تمنچے دیکھکر ذرا گھبراہٹ ہوئی۔ مگر میں نے اپنے اوسان درست کر کے کہا مجھے کچھ عذر نہیں بشرطیکہ دُردانہ مجھ سے ملنے کا اقرار کریں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ہیں اور انہی سے تم کو کاغذات کا پتہ چلا ہے۔ کہا ہاں یہ سچ ہے دُردانہ تم سے ملے گی معلوم ہوا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ نے اپنا بزرگ رازدار سمجھکر دفینوں کی یادداشت تمہارے باپ کے پاس امانت رکھدی تھی اور کہا تھا کہ ضرورت کے وقت میرے لایق جانشینوں کو دے دینا۔

میں نے پوچھا تو کیا دُردانہ رات کو محل میں رہتی ہے۔ بولے نہیں آدھی رات کے قریب وہ کشمیری دروازہ کے مکان میں آجاتی ہے اور وہیں ہم رہتے ہیں۔

میں نے ان سے مکان کا پتہ دریافت کیا اور اس کے بعد کہا کہ صاحب مجھے کاغذات لادینے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر والد صاحب نے خبر نہیں ان کو کہاں رکھا ہے میں نے تو آج تک ان کا ذکر بھی نہیں سُنا۔

جاسوسوں نے کہا دیکھو جھوٹ نہ بولو حسن ن تم نے دُردانہ کو دیکھا ہے اُسی دن کاغذوں کا ذکر آرہا تھا۔

اب تو میں ذرا پریشان سا ہوا۔ آخر جی کڑا کر کے کہا۔ صاحب تو مجھ سے نہ ہوگا۔ یہ سنتے ہی اُنھوں نے پھر تمنچے نکال لئے اور میری طرف اُنکو جھپٹایا۔ بدن میں طاقت تھی اوسان درست تھے میں نے لپک کر تمنچوں کو پکڑ لیا اور جھٹکا دے کے چھین لیا اور اس کے بعد ایک مُکہ اس کے اور ایک مُکہ دوسرے کے اس زور سے مارا کہ وہ چکرا کر گر پڑے۔ اور میں نے دوڑ کر اُنکے ہاتھ باندھ دیئے۔ دونوں کو باندھکر حجرہ میں قفل لگا کر میں کشمیری دروازے پہنچا۔ کوئی گیارہ بجے کا عمل ہوگا۔ جاسوسوں کے بتائے ہوئے مکان پر جاکر آواز دی دُردانہ نے پوچھا کون ہے۔ میں نے کہا ذرا دروازہ پر آؤ۔ دُردانہ قریب آئی تو میں نے کہا۔ ان دونوں صاحبوں نے بھیجا ہے۔ وہ تکیے کے پاس جو شاہ صاحب آکر رہے ہیں وہاں بیٹھے ہیں۔ اور شاہ صاحب سے اقرار ہوگیا ہے اس لئے اُنھوں نے تم کو بلایا ہے۔ کہ آجاؤ تو کاغذات ابھی ملجائیں دُردانہ نے کہا تو ڈولی منگالو چلتی ہوں۔

میں محلہ میں جاکر ڈولی لے آیا۔ اور کہاروں کو چپکے سے سمجھا دیا کہ خاص بازار لے چلنا۔ چنانچہ دُردانہ کو سوار کر کے میں اپنے گھر آیا۔ اور ایک علیحدہ دالان میں سواری کو اُتروایا۔ امّاں اُس وقت سوگئی تھیں۔ ابّا بالا خانہ پر تھے۔ امّاں کو جگا کر سارا حال کہا۔ وہ

ڈریں مگر میری عاجزی سے چُپ ہوگئیں۔ اور میں دُردانہ کو دوسرے دالان میں لیگیا
چراغ روشن کرتے ہی دُردانہ ہک دھک رہ گئی۔ اور بولی ہائیں تم یہاں کہاں لائے۔
میں نے کہا دیکھو صاحب اب یہ تمہارا گھر ہے۔ اگر تم نے شور وغل مچایا تو جان
کی خیر نہیں۔ اُن جاسوسوں کو میں نے قید کرلیا ہے اور تم بھی میری قید میں ہو۔ گومیرا
دل تمہارا قیدی ہے۔ میں سب حال سے خبردار ہو گیا ہوں تم رضامندی سے چپ ہوگئیں
تو یہ تمہارا گھر ہے بیوی بناکر رکھونگا۔ ورنہ تم کو اور ان دونوں کو جان سے مارڈالونگا۔
دُردانہ نے کہا۔ مجھے آپ کے ہاں رہنے سے کوئی عذر نہیں۔ میرا دل تو خود اسی کا
آرزومند تھا۔ مگر اِن جاسوسوں کو چھوڑدو ورنہ خیر نہ ہوگی۔ بڑا تہلکہ پڑ جائیگا اگر اِن کا
بال بیکا ہوا۔ میں نے کہا اگر اِن کو چھوڑ دیا تو میری مشکل آئیگی۔ دُردانہ نے کہا کچھ مشکل نہیں
تم ابھی وہاں جاؤ اور ان سے کہو کہ اصلی کاغذات تو لا نہیں سکتا اِن کی نقل لادیتا ہوں
مگر اِس شرط پر کہ دُردانہ کے معاملہ پر پردہ ڈالدیا جائے۔
میں نے کہا کہ مجھ سے تو یہ نمک حرامی نہ ہوگی کہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والے بادشاہ
کا بھید دوسروں کو دے دوں۔ دُردانہ نے کہا یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ فرضی باتیں
کاغذوں میں لکھدو۔ اُنھوں نے اصل کاغذات دیکھے تھوڑے ہی ہیں جو وہ شک کرینگے۔
قلعہ کے اندر دفینے ہیں وہ اُن کو کھود بھی نہیں سکتے۔ صرف یادداشت چاہتے ہیں۔
تاکہ آئندہ کے لئے کام آئے۔
میں نے اِس تجویز کو پسند کیا اسی وقت کہ رات کا ایک بجا تھا پھر تکیہ پر گیا۔ حجرہ سے
جاسوسوں کو نکالا۔ اور سارا حال کہا وہ بولے کہ اگر تم ان کاغذات کی نقل دیدوگے
توہم دُردانہ کے معاملہ میں تمہارا ساتھ دیں گے۔
وہ رہا ہوکر اپنے گھر گئے اور میں نے کہا کہ کل دوپہر کو نقل آپ کے مکان پر پہنچ جائیگی۔
دوسرے دن صبح سے میں نے نقل شروع کی۔ دُردانہ اپنی ذہانت سے فرضی مقامات

بتائی جاتی تھی اور میں لکھتا جاتا تھا۔

اتنے میں ابا جان بالاخانہ سے نیچے آئے میں ان کی خفگی کے ڈر سے اماں کے پاس چلا گیا۔ دُردانہ نے جُھک کر سلام کیا والد اماں کے پاس گئے تو میں وہاں سے بھی اُٹھ کر چلا آیا۔ اماں نے سارا حال بیان کیا۔ ابا یہ حالت سُنکر سناٹے میں آ گئے اور بولے اب خیر نہیں۔ ارے بڑا غضب ہوا۔ اور یہ تو چلّہ کرنے گیا تھا۔ اس مینا کو کہاں سے لے آیا اچھا اچھا تو میں ان دونوں کا کام تمام کئے دیتا ہوں۔

یہ سُنکر اماں ہاتھ جوڑنے لگیں اور ابا کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ابا سیدھے میرے پاس آئے اور دُردانہ کے فرضی بتائے ہوئے کاغذات کو دیکھا تو مسکرائے اور بولے بھئی خوب جُل دیا ہے۔ خیر تمہاری مرضی۔

والد باہر گئے۔ میں سیدھا جاسوس کے مکان پر پہنچا اور کاغذ اُن کو دیا جس کو دیکھکر وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ جواں بخت کو تخت مل گیا تو نہال کر دیا جائیگا۔

اس کے بعد میں گھر آیا اور دُردانہ سے نکاح کر کے ہنسی خوشی رہنے لگا۔

غدر

چند روز کے بعد غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ والد صاحب غدر سے پہلے اپنے ایک مرید کے ہاں انبالہ چلے گئے تھے میں اور دُردانہ بھی ساتھ تھے۔

جب غدر کا فتنہ فرو ہوا تو انبالہ ہی میں والد صاحب نے رحلت فرمائی اور میں دلی میں واپس آیا۔ مگر یہاں دیکھا تو خاص بازار کھد کر زمین کے برابر ہو چکا تھا ناچار ایک مکان کرایہ کو لیا اور اس میں رہنا شروع کیا۔

اب والد کے جتنے مرید و معتقد تھے وہ یا تو جلا وطن ہو گئے تھے یا پھانسیاں پا گئے تھے۔ یا غریب و مفلس ہو گئے تھے۔ مجھکو ان سے امداد کا کوئی موقع نہ رہا تھا۔ اور خود کچھ کام آتا

تھا۔ جو گذرا وقات کی سبیل ہوئی۔ کچھ دن تو پچھلا اندوختہ خرچ ہوتا رہا۔ اس کے بعد تنگی شروع ہوئی دو ایک فاقے بھی ہوئے۔ اب ہمارے دو بچے بھی تھے اور دُردانہ بہت فضول خرچ واقع ہوئی تھی۔ آخر دُردانہ کے مشورہ سے ہمنے پھر چلّے کی ٹھانی اور اسی پرانے حجرہ میں جا کر آسن جمایا۔ چند روز کے بعد ہندو عورتیں تعویذ گنڈے کے لئے آنے لگیں۔ اور صبح سے شام تک روپیہ سوا روپیہ کی آمدنی ہو گئی۔

پانچ پیسہ کا تعویذ دینا اور پانچ آنے کو گنڈا یہ معمول ہو گیا تھا۔

ایک دن دوپہر کو سوتا تھا کہ خواب میں حضرت دین علی شاہ قلندر اور اپنے والد کو دیکھا کہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور کہتے ہیں دیکھو مینے ساری عمر نگینہ سازی کی اور میرا بیٹا دوسرے کی کمائی پر ذلیل اوقات بسر کرتا ہے۔

آنکھ کھلی تو بے اختیار رونا آگیا۔ سیدھا دُردانہ کے پاس آیا اور سارا حال اُس سے کہا دُردانہ نے کہا خواب خیال ہیں۔ اب یہ نہ کرو گے تو کیا کرو گے کام کچھ آتا نہیں۔

میں نے کہا نوکری کروں گا۔ یہ ٹھان کر نوکری کی تلاش شروع ہوئی اور ایک مکتب میں دس روپیہ ماہوار کی ملازمت کر لی۔

اسی زمانہ میں دُردانہ بیمار ہوئی۔ ہر چند علاج کیا۔ مگر جانبر نہ ہو سکی۔ اس کے مرنے نے مجھ پر بچوں کی پرورش کا بوجھ ڈالدیا۔ نوکری پر جاتا تو بچوں کو ساتھ لیجاتا۔ بازار سے روٹی کھانا۔ غرض اس طرح بمشکل ایک سال گذرا۔

پکانیوالی ماما

مکتب میں میری ترقی ہو گئی۔ بیس۲۰ روپیہ ملتے تھے اور شام کو دو لڑکے گھر پر پڑھنے آتے تھے۔ تیس۳۰ روپیہ میرے لئے بہت تھے۔ اس لئے ایک دن یہ خیال ہوا۔ کہ کسی پکانے والی ما کو نوکر رکھنا چاہئے بغیر اسکے گذارا مشکل ہے۔

اسی تلاش میں تھا کہ ایک دن ایک غریب عورت برقعہ اُوڑھے بھیک مانگنے آئی۔ میں نے کہا نیک بخت نوکری کر لے۔ بھیک مانگنا بہت بُرا ہے۔ اُس عورت نے رونے کی آواز میں کہا۔ میاں تم ہی نوکر رکھ لو۔ سب ضمانت مانگتے ہیں میں کہاں سے ضمانت لاؤں۔

میں نے کہا تم کون ہو۔ تمہارا کوئی ولی وارث بھی ہے۔ اُس نے بے اختیار ہچکیاں لیکر رونا شروع کیا۔ اور کہا سوائے خدا کے کوئی نہیں۔ زیادہ نہ پوچھو کہ مجھ میں بیان کی تاب نہیں ہے۔

میں نے کہا اچھا تو ہمارے یہاں روٹی پکایا کرو۔ اُس نے قبول کیا اور روٹی پکانے لگی۔ مگر ہمیشہ وہ پردہ کا خیال رکھتی تھی۔ اور کبھی میرے سامنے نہ آتی تھی۔ لیکن ایک دن اتفاق سے میری نگاہ اُس پر پڑ گئی۔ دیکھا تو جوان اور قبول صورت تھی میں نے اُس سے کہا صاحب بڑی مشکل ہے تمہارے پردے سے تو جی گھبراتا ہے۔ کیوں نہ تم مجھ سے نکاح کر لو تاکہ یہ حجاب اُٹھ جائے ماما نے کچھ رک کر آخر اقرار کر لیا اور میں نے اس سے نکاح پڑھا لیا۔

نکاح کے بعد میں نے اُس کو دیکھا تو صورت کچھ آشناسی نظر آئی۔ مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں نے پہلے اس کو کہاں دیکھا ہے۔ ایک دن اس نے خود ہی کہا۔ تم کو شاید یاد نہ ہو میں بچپن میں اماں جان کے ساتھ تمہارے گھر میں بہت آیا کرتی تھی۔ میں بہادر شاہ بادشاہ کی نواسی ہوں۔ گوہر بیگم میرا نام ہے۔ گوہر بیگم نام سنکر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ خدا کی شان یہ وہی شہزادی تھی جس کے بڑے چاؤ چوچلے تھے۔ اپنی اماں کی اکلوتی تھی۔ اور ہمارے ہاں بڑی شان و شوکت سے آیا کرتی تھی۔

میں نے پوچھا۔ آخر بتاؤ تو سہی تم پر غدر میں کیا کیا بیتی۔ اور تم اب تک کہاں کہاں رہیں؟

شہزادی کی آپ بیتی

غدر میں میری عمر تیرہ[۱۳] سال کی تھی۔ غدر ہی کے اندر اماں جان کا انتقال ہو گیا اور میں

بڑی دائی کے پاس رہتی تھی۔ جب بادشاہ دہلی سے بھاگے تو دائی مجکو لیکر انگریزی جرنیل کے پاس چلی گئی اور سارا حال بیان کیا۔ اُس نے بہت محبت سے اپنے خیمہ میں مجکو رکھا اور دوسرے دن ایک پنجابی مسلمان افسر کے حوالہ کر دیا۔ وہ افسر مجکو لئے ہوئے لکھنؤ گیا۔ وہاں اِس زمانہ میں لڑائی ہو رہی تھی جس میں افسر بچارا مارا گیا اور میں بھاگ کر اناّؤ چلی گئی۔ اناؤ میں ایک ہندو نے اپنے گھر میں رکھا۔ مگر اُس کی نیت بد دیکھکر میں وہاں سے بھاگی۔ راستہ میں ایک دیہاتی زمیندار ملا اور وہ مجکو اپنے گھر لے گیا اور چند روز کے بعد اپنے لڑکے سے میری شادی کر دی۔ مگر مجکو ان گنواروں میں رہنا دوبھر تھا۔ بس دوزخ کا مزا آتا تھا۔ خدا کی قدرت گنواروں میں وہاں کے کھیت پر لڑائی ہوئی اور میرے شوہر اور سُسرے کو دشمنوں نے مار ڈالا اور میں اِس گھر سے نکلکر کانپور آئی۔ یہاں ایک سوداگر کے ہاں ماماگیری کی نوکری کر لی۔ یہ سوداگر بڑا بدچلن تھا مجھ سے تو اس نے کچھ نہ کہا مگر رات دن اس کے ہاں حرام کار عورتوں کی آمد رفت رہتی تھی۔ جس سے میرا جی بیزار ہو گیا اور میں نے چاہا کہ دہلی چلی جاؤں۔ چنانچہ ایک موقع پر سٹیشن پہنچی اور بابو سے خوشامد کی کہ مجھے دہلی پہنچا دو۔ اُس نے مال گاڑی میں گارڈ کے سپرد کر دیا جس نے مجکو دہلی لاکر اُتار دیا۔

دہلی میں آئی تو حیران تھی کہ الٰہی کہاں جاؤں۔ کوئی جان پہچان نہ تھا۔ سوچتے سوچتے چیلوں کے کوچہ میں آئی یہاں میرا اللو کہار رہتا تھا۔ اللو کہار تو مر گیا تھا اُس کی بیوی نے حال سُنا تو اپنے پاس رکھ لیا۔ اُس کے بیٹے مچھلیاں پکڑتے تھے ڈولی کا کام چھوڑ دیا تھا میں اُن کے گھر میں روٹی پکاتی تھی۔

ایک دن رات کو کہار کے لڑکے نے کہا۔ یہ امیر لوگ بھی بڑے آرام سے ہیں۔ دھوپ میں مچھلیاں تو ہم پکڑیں اور یہ مزے سے بیٹھ کر کھائیں۔ میں نے کہا دام بھی تو دیتے ہیں اور دام کمانے میں اُن کو تم سے زیادہ محنت اور فکر کا شکار ہونا پڑتا ہو گا۔

کہار یہ سُنکر بگڑ گیا اور بولا چل ری۔ تو ہماری بات میں دخل دینے والی کون یہ کہکر ایک

بانس میرے سر پہ مارا مغز پھٹ گیا اور میں بیہوش ہو کر گر پڑی۔

ہوش آیا تو دریا کی ریت میں پڑی تھی۔ اور آس پاس کوئی نہ تھا۔ ہلنے جلنے کی طاقت نہ تھی۔ ہندو عورتیں جمنا پر نہانے جا رہی تھیں۔ میں نے ان سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ مجھے شفاخانہ پہنچا دو۔ میرے چوٹ لگ گئی ہے۔ اُنھوں نے رحم کھا کے ڈولی منگا دی اور میں شفاخانہ آئی۔ وہاں علاج ہوا اور اچھی ہو کر صدر بازار میں پہنچی وہاں ایک پنجابی کے ہاں روٹی پکانے کی نوکری کر لی۔

غرض اس طرح یہ دن بسر ہوئے پنجابی بھی بہت بدچلن تھا۔ اس کی بُری نگاہیں دیکھ کر میں نکل آئی اور بھیک مانگنے لگی۔ کیونکہ دو چار جگہ نوکری کو کہا تو اُنھوں نے ضمانت مانگی۔

ایک دن بھیک مانگ رہی تھی کہ ایک لڑکا روٹی دینے آیا۔ مجکو اُس کی صورت دیکھکر کچھ محبت سی آئی۔ پوچھا تم کون ہو۔ اُس نے کہا میری اماں روٹی پکاتی ہیں۔ میں نے کہا ان کا کیا نام ہے۔ بولا رقیہ۔ رقیہ نام سُنکر مجھے شک ہوا کہ شاید میری بھپی ہیں۔ اندر گھر میں چلی گئی۔ دیکھا تو واقعی پھپھی جان تھیں۔ پھپھی جان نے مجکو پہچانا۔ گلے مل کر خوب روئیں اور اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ چند روز میں نے اُن کے ساتھ کام کیا۔ مگر ایکدن اُس گھر میں کچھ چوری جاتا رہا۔ صاحب خانہ نے پولس کو بُلا کر کہا کہ یہ اجنبی عورت ہمارے ہاں آئی ہے اسی کا کام معلوم ہوتا ہے۔ پولس والے مجکو کوتوالی لے گئے اور وہاں مجھ پر تنبیہ شروع کی۔ ایک نے میری چوٹی پکڑ کر گھسیٹا۔ اُس وقت میں نے آسمان کو دیکھا کہ

میں ہند کے شہنشاہ کی نواسی ہوں میں چور نہیں ہوں۔ مجھے یہ کیوں ستاتے ہیں۔ الٰہی میرا دنیا میں کوئی حمایتی نہیں میں کس سے کہوں کہ بےقصور ہوں۔

یہ سوچ رہی تھی کہ سپاہی نے جوتیاں مارنی شروع کیں۔ یہ ذلت ایسی سخت تھی کہ مجکو

غش آگیا۔ آخر تھانہ دار نے رحم کھا کے مجکو چھوڑ دیا۔ اور میں بھیک مانگتی مانگتی آپکے ہاں آگئی۔

پیرجی گھسیارے

میں نے ماما اور حال کی بیگم کا یہ افسانہ سُنکر ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا دنیا میں بھی کیا کیا انقلاب پیش آتے ہیں۔ مگر دنیا والے ذرا نہیں گھبراتے۔ نہ اچھے وقت کا کچھ اعتبار ہے نہ بُرے وقت کا۔ ایک سا وقت کسی کا نہیں رہتا۔ انسان کو نہ خوشی میں اترانا چاہیئے نہ تکلیف میں گھبرانا۔

چند روز ہم بہت ہنسی خوشی سے رہے۔ مگر اتنے میں میرے مکتب کی نوکری جاتی رہی ذرا سے قصور پر مجکو موقوف کر دیا گیا۔ لڑکوں نے بھی جو میرے پاس پڑھنے آتے تھے آنا چھوڑ دیا۔

اب پھر معاش کی تنگی ہوئی۔ جگہ جگہ نوکری کی تلاش کو گیا۔ مگر کہیں دستیاب نہ ہوئی اسی حالت میں ایک دن میں درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں زیارت کو گیا واپسی میں دیکھا کہ ایک گھسیارا گھوڑے پر گھاس لادے چلا جاتا ہے۔ میں نے راستہ کاٹنے کو اُس سے باتیں شروع کیں۔

پوچھا کیوں بھئی۔ یہ گھاس کتنے کو بک جائیگی۔ اُس نے کہا تین ساڑھے تین روپیہ کو مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے کہا اوہ اس میں تو بڑا نفع ہے۔ گھسیارے نے کہا محنت بھی تو ہے۔ صبح چار بجے گیا تھا اب چار بجے شام تک اتنی جمع ہوئی ہے۔ میں نے کہا جنگل سے مفت لاتے ہو یا کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس نے کہا چالیس روپیہ کا ایک جنگل ٹھیکہ پر لیا ہے وہیں سے لاتا ہوں۔ ایک جنگل چھ مہینے کو کافی ہے۔ ایک رُخ سے کھودتا ہوں دوسرے دن دوسری جانب سے۔ تیسرے دن اور طرف سے۔ اس طرح یہ پھیر بندھا رہتا ہے۔ کہ جب

اول دن کی کھدی ہوئی زمین کو آٹھ دن ہو جاتے ہیں تو نئی گھاس پیدا ہو جاتی ہے اور پھر از رزق از سر تو وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ آٹھ آنے روز گھوڑے کا خرچ ہے تین روپیہ کا مکان ہے باقی گھر کے کام آتا ہے۔ میں اکیلا ہوں ایک بیوی ہے۔ اگر بچے بھی ہوتے تو اتنی محنت نہ ہوتی۔ کچھ وہ کھودتے کچھ میں۔ دوپہر سے پہلے گھوڑے کا بوجھ ہو جاتا یہ سنکر میں گھر آیا اور سارا حال بیوی سے کہا۔ اُس نے کہا گھاس کھودنے میں کچھ عیب نہیں بڑے بڑے بزرگوں نے یہ پیشہ کیا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے بیوی کا زیور بیچ کرایک ٹٹو خریدا جنگل جاکر ایک زمین ٹھیکہ پر لی۔ تین کھرپے خریدے اور بچوں کو لیکر گھاس کھودنے گیا۔ چند روز تو ذرا مشکل رہی مگر پھر عادت ہو گئی۔ اب ہم تینوں باپ بیٹے دوپہر سے پہلے گھوڑا بھر لاتے ہیں اور گھاس کی منڈی میں دوکاندار کے ہاتھ جس سے ٹھیکہ ہو گیا ہے کھڑے کھڑے تین روپیہ کو گھاس فروخت کر کے گھر آجاتے ہیں۔ پھر میں مسجد میں جاتا ہوں اور شام تک اللہ اللہ کر کے مگن رہتا ہوں۔ سینکڑوں عورت مرد تعویذ گنڈے کو آتے ہیں اور میں ان کو تعویذ مفت تقسیم کرتا ہوں جس میں اللہ اثر دیتا ہے۔

لوگ میرے پیشے سے آگاہ ہیں اور بجائے نفرت کرنے کے سمجھتے ہیں کہ میں کوئی بڑا پہنچا ہوا فقیر ہوں۔ جو اکل حلال کے لئے گھاس کھودتا ہوں۔ اس واسطے ان کے دل میں میری بڑی عزت و قدر ہے ۷۵ روپیہ ماہوار اس پیشہ میں ملتے ہیں۔ اور کالج کے بی۔ اے پاس لوگوں سے میری اچھی گذر جاتی ہے جنکو ۲۵ روپیہ کی غلامی بھی نصیب نہیں۔

نواں فسانہ

ٹھیلہ والا شہزادہ

۱۹۱۱ء کے دربار میں دہلی کے دن پھرے نئے شہر کی تیاریاں شروع ہوئیں نقشے

بنے۔ نامور انجنیروں کی دماغ آرائیاں اپنے جوہر دکھانے لگیں۔ شاہانِ اودھ کے مورث منصور علی خاں صفدر جنگ کے مقبرے کے آس پاس گما اینٹ بنانے اور پکانے کے کارخانے جاری ہوئے۔ ہزاروں غریبوں کا روزگار چمکا پکی ہوئی اینٹوں کا تانبا ریل گاڑیوں اور ٹھیلوں میں سوار ہو ہو کر امپیریل سٹی (شہنشاہی شہر دہلی) کی تعمیرات میں جانے لگے۔

۱۱ مئی ۱۹۱۱ء کا ذکر ہے۔ ٹھیک دوپہر کی دہوپ اور حواس کھونے والی گرمی میں ایک بوڑھا ٹھیلہ والا۔ خان بہادر سیٹھ محمد ہاروں کے بھٹہ سے اینٹیں لیکر دہلی جار ہا تھا۔ سر پر سورج کی تیز کرنیں سفید ڈاڑھی اور مونچھوں پر راستہ کا گرد و غبار۔ پیشانی پر پسینہ جسم میں اینٹوں کی سُرخی جمی ہوئی۔

پیچھے سے ایک موٹر (غالباً قطب صاحب سے) آ رہی تھی۔ ڈرائیور نے ہر چند بگل بجایا مگر بوڑھے اور بہرے ٹھیلہ والے نے اُسکی آواز نہ سُنی اور ٹھیلہ کو سڑک سے نہ بچایا موٹر قریب آئی اور ٹھیلہ سے ٹکرائی۔ ڈرائیور بہت ہوشیار تھا فوراً موٹر کو روک لیا اور ٹھیلہ کی ٹکر سے موٹر کو کچھ نقصان نہ پہنچا۔

اِس موٹر میں ایک پنجابی سوداگر جوانی اور شراب کے نشے میں چور کسی بازاری عورت کو لئے بیٹھا تھا۔ ٹھیلہ والا کو غریب بوڑھا اور کمزور دیکھکر غصہ سے بیتاب ہو گیا ہاتھ میں بطور فیشن کے ایک کوڑا تھا۔ اُسی کو لیا۔ موٹر سے اُترا اور بچارے ٹھیلہ والے کو مارنے لگا

ٹھیلہ والا اکیلا تھا۔ ضعیف اور ناتوان تھا اور سب سے بڑھکر یہ کہ مفلس و نادار تھا۔ مگر خبر نہیں دل میں کیا ہمت اور جرأت رکھتا تھا کہ چار کوڑے تو پہلے حملے میں اُس نے کھائے لیکن پھر بیل ہانکنے کا چابک لیکر اُس نے بھی اِس مخمور نوجوان پر حملہ کیا اور چابک کے بانس کا ڈنڈا ایسا مارا کہ شرابی عیاش کا مغز پھٹ گیا۔ موٹر ڈرائیور نے چاہا کہ وہ اس بوڑھے کو سزا دینے کو آگے بڑھے۔ مگر قدم بڑھانے سے پہلے ہی چابک

کی لکڑی اُس کے سر پر بھی پڑی جس نے اُس کا چہرہ بھی خون سے لال کر دیا۔ موٹر نشین عورت نے گھبرا کر رونا شروع کیا اور بلبلا کر چیخی کہ خدا کے لئے تم موٹر میں آجاؤ۔ ورنہ یہ گنوار تم کو جان سے مار ڈالیگا۔

یہ سُنکر جوان اور موٹر بان دونوں موٹر میں بیٹھ گئے اور ٹھیلہ والے کو گالیاں دینے لگے بوڑھا خاموش کھڑا مسکراتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ بس ایک ہی وار میں بھاگ نکلے۔ تیموری طمانچہ کھانا آسان نہیں ہے۔

ٹھیلہ والا اس قدر بہرا تھا کہ موٹر والوں کی گالیاں اُس نے نہ سُنیں اور پھر ٹھیلہ پر آن بیٹھا۔ موٹر بھی دہلی چلی گئی اور ٹھیلہ بھی رسینہ (وہ مقام جہاں نئی دہلی کی تعمیر ہو رہی ہے) میں اینٹیں ڈالنے روانہ ہو گیا۔

(۲)

رسینہ کے تھانہ میں دوسرے دن دو زخمی اور چند ٹھیلے والے جمع تھے وہ بوڑھا ٹھیلے والا بھی کھڑا تھا۔ داروغہ پولس نے پوچھا کیا تم نے ان کو زخمی کیا ہے؟

بوڑھا چپ کھڑا رہا۔ داروغہ نے پھر ذرا بگڑ کر سوال کیا اور کہا بولتا کیوں نہیں دوسرے ٹھیلے والے بولے حضور یہ بہرا ہے۔ تب ایک سپاہی نے بوڑھے کے کان کے پاس جاکر آواز سے یہی سوال کیا تو بوڑھے نے جواب دیا ہاں مینے مارا ہے۔ انھوں نے پہلے مجھ پر حملہ کیا چار کوڑے مارے تو میں نے بھی جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ یہ امیر لوگ غریبوں کو گھاس پھوس سمجھتے ہیں۔ آج سے ساٹھ برس پہلے اِن زخمیوں کے ماں باپ میرے غلام تھے۔ اور یہی نہیں سارا ہندوستان میرا محکوم و تابعدار تھا۔

داروغہ پولس ہنسا اور اُس نے کہا شاید یہ پاگل ہو گیا ہے بڑھاپے نے اسکی عقل کھو دی۔ اچھا اِس کو حوالات میں لیجاؤ۔ کل عدالت میں چالان جائے گا۔ ایسے دیوانہ کو پاگل خانہ بھیجنا چاہیئے۔

(۴۲)

ریٹی مجسٹریٹ کے ہاں بوڑھا ٹھیلہ والا پولس کی حراست میں حاضر تھا اور دونوں مدعی بھی موجود تھے کورٹ انسپکٹر نے واقعات پیش کئے تو عدالت نے مدعا علیہ کا بیان لینا چاہا اور یہ معلوم کرکے کہ وہ بہرہ ہے چپراسی نے چیخ چیخ کر اس کا اظہار لیا بوڑھے نے بیان کیا۔

میرا نام ظفر سلطان ہے۔ میں میرزا بابر برادر بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں میرے دادا ہندوستان کے شہنشاہ معین الدین اکبر شاہ ثانی تھے۔ غدر کے بعد میں لمبی پریشانیوں کے بعد ملکوں ملکوں پھرتا ہوا دہلی میں آگیا۔ اور ٹھیلہ چلانے کا کام کرنے لگا ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء جو ۱۱ مئی ۱۹۱۷ء کی طرح گرم اور سخت تھی اس واقعہ کی تاریخ ہے میں بہرا ہوں۔ میں نے موٹر کی آواز نہیں سنی۔ موٹر والوں نے میری عمر اور حالت پر رحم نہ کیا۔ اور میرے چار کوڑے مارے میرے بدن میں جو خون ہے اُسکو مار کھانے کی اور ظلم و جور سہنے کی اب تو عادت ہو گئی ہے مگر پہلے نہ تھی۔ جس جگہ عدالت کی کرسی ہے اسی مقام پر غدر سے پہلے میرے حکم سے بارہا بہت سے شریروں اور سرکشوں کو سزائیں دی گئی ہیں۔ میرے دل و دماغ نے ان عادتوں کو فراموش نہیں کیا۔ گو میری آنکھوں نے ان نظاروں کی دید مدت سے ترک کردی ہے۔ میں کیونکر چار کوڑوں کو برداشت کرسکتا تھا۔ میں نے بیشک بدلہ لیا۔ اور ان دونوں بہادر جوانوں کے سر پھاڑ ڈالے اگر آپ شریف لوگوں کا انصاف کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کے فیصلے کے سامنے سر جھکانے کو تیار و آمادہ ہوں۔"

بوڑھے کی تقریر سُن کر عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ مجسٹریٹ صاحب جو ہولڈر میں تھے قلم مُنہ میں لیکر بوڑھے کو دیکھنے لگے اور ان کا مسلمان شیشہ دار آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ دونوں مدعی بھی یہ بیان سُنکر دم بخود رہ گئے۔

عدالت نے حکم دیا۔ تم کو رہا کیا جاتا ہے۔ اور مدعیوں پر دس دس روپے جرمانہ کیونکہ خود ان کے بیان سے ظاہر ہے۔ کہ انھوں نے نشہ کی حالت میں پہلے مدعا علیہ پر حملہ کیا تھا۔

اس کے بعد مجسٹریٹ نے چپراسی کے ذریعہ بوڑھے شہزادے سے پوچھا کیا تمہاری پنشن سرکار سے مقرر نہیں ہوئی۔ تم ٹھیلہ کا ذلیل کام کیوں کرتے ہو۔

شہزادے نے جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ انگریزی سرکار نے ہمارے خاندان والوں کی پانچ پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی ہے۔ مگر میں اوّل تو برسوں دہلی سے غیر حاضر رہا اس کے علاوہ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں۔ کام کرکے محنت کی روزی کمانی فرض سمجھتا ہوں۔

جناب! مجھ کو ٹھیلہ میں تین چار روپے روزانہ مل جاتے ہیں دو روپے روز بیلوں وغیرہ کا خرچ ہے جس میں گھر کا کرایہ بھی شامل ہے اور روپیہ دو روپیہ مجھ کو بچ جاتے ہیں۔ میں پانچ روپیہ مہینہ لیکر کیا کرتا۔ آج کل میں بہت خوش ہوں اور مجھ کو ہرطرح کی آزادی اور بے فکری ہے۔ جو لوگ آپ کی کچہریوں میں نوکریاں تلاش کرتے پھرتے ہیں اور بی۔ اے۔ ایم اے پاس ہونے میں عمریں برباد کرتے ہیں ان سے مجھ ٹھیلہ والے کی حالت لاکھ درجہ بہتر ہے۔ ٹھیلہ چلانے میں کچھ ذلت نہیں ہے کیونکہ میں بیلوں پر حکومت کرتا ہوں اور خود بیل بنکر محکوم نہیں بنتا۔

(۴)

ٹھیلہ والا شہزادہ پہاڑ گنج کی مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اور اسی کے قریب اسکا گھر تھا جب وہ نماز پڑھ چکا تو ایک شخص اسکے پاس گیا اور کہا میں آج کچہری میں موجود تھا اور میں نے آپکے بیان کا چرچا سُنا تھا۔ کیا آپ مجھکو غدر کے حالات سُنا سکتے ہیں کہ آپ غدر میں اور اس کے بعد کہاں کہاں رہے اور آپ پر کیا کیا مصیبت پڑی۔

ٹھیلہ والے نے مسکرا کر کہا کیا آپ وہ حالت سُن سکتے ہیں۔ اور کیا آپکو ان جھوٹی باتوں پر یقین آسکتا ہے۔ کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو بات گذر جائے خواہ وہ خوشی کی ہو یا تکلیف کی ہو جھوٹی ہے اُسکا بیان کرنا جھوٹ بولنا ہے۔ آنیوالا زمانہ وہم ہے۔ گزرنے والا وقت جھوٹا ہے اور موجودہ گھڑی سچی ہے میرا خیال تو یہ ہے کہ جو وقت سامنے ہے اُسپر یقین کروں اور ہنسی خوشی اُس کو گزار دوں۔ نہ گزری وقت کی یاد دل میں آنے دوں۔ نہ آنیوالے زمانہ کا فکر ذہن میں لاؤں بس جو کچھ سمجھوں اسی وقت کو سمجھوں جو آنکھوں کو نظر آتا ہو۔ اور جس میں موجودہ سانس کی آمد و رفت ہو۔

سائل نے کہا یہ تو آپ کی ذاتی تجربہ کی باتیں ہیں۔ آپ کے دل کو صدموں اور حادثوں نے دنیا سے اوداس کر دیا ہے۔ مگر میں تو واقعات غدر کی یادداشت مرتب کرنے کو آپ سے یہ حالات پوچھتا ہوں۔ میں نے اور بھی اسی طرح بہت سے واقعات جمع کئے ہیں۔ اور آپ بیتی کیفیت شہزادوں سے پوچھ پوچھ کر لکھی ہے۔

یہ سُنکر شہزادہ نے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا شاید آپ اخبار والے ہیں۔ میں اُن لوگوں سے سخت بیزار ہوں۔ یہ بہت ہی جھوٹ بولا کرتے ہیں۔ اچھا آپ میرے گھر پہ چلئے میں جہان کی دلشکنی نہیں کرونگا۔ اور آپ جو پوچھیں گے بتاؤں گا۔

شہزادہ سائل کو لیکر اپنے گھر میں گیا۔ چھپر کا ایک مکان تھا۔ باہر صحن میں دو بیل اور ایک گائے بندھی ہوئی تھی اندر دالان میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ برابر ایک پلنگ تھا دونوں پر سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جن سے غریب مگر محنتی اور کماؤ شہزادہ کی نفاست مزاجی ظاہر ہوتی تھی۔ شہزادہ نے سائل کو تخت پر بٹھایا اور خود باورچی خانہ سے کھانا لایا۔ اور کہا آؤ پہلے کھانا کھالو۔ پھر باتیں کریں گے۔ کھانا اگرچہ ایک آدمی کا تھا مگر دو قسم کا سالن۔ دال چٹنی اور کچھ مٹھاس اس بات کو ظاہر کرتی تھی کہ شہزادہ اس حالت میں بھی مکلف زندگی بسر کرتا ہے۔ سائل نے ہر چند عذر کیا

مگر شہزادہ نہ مانا اور دونوں نے کھانا کھایا۔ اور پھر شہزادہ نے خود حقہ بھرا اور سائل کے آگے رکھا۔ اُس نے حقہ نہ پینے کا عذر کیا۔ تو شہزادہ نے کلی کو آگے رکھکر یہ داستان کہنی شروع کی۔

(۵)

میں میرزا بابر کا بیٹا ہوں۔ میرزا بابر بہادر شاہ کے بھائی تھے۔ غدر سے پہلے بہادر شاہ کی حکومت تو ہندوستان میں نہ تھی۔ مگر عزت بادشاہوں کی سی ہر صوبہ۔ ہر شہر اور ہر آبادی میں اُن کے نام کی کیجاتی تھی۔ اور دہلی میں تو ہر شخص بہادر شاہ اور اُنکے خاندان کا وہی ادب ولحاظ کرتا تھا جو شاہ جہاں اور عالمگیر کے وقت میں ہوتا تھا میں اپنے باپ کا بہت لاڈلا بیٹا تھا۔ اگرچہ ان کے اولاد اور بھی تھی۔ مگر اپنی ماں کا میں اکلوتا تھا۔ میرے والد کا غدر سے پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ جب غدر پڑا اور باغیوں کی فوج دہلی میں گھُسی۔ تو جیسی ستم کاریاں اُس نے انگریزوں اور ان کی عورتوں اور بچوں پر کیں اُن کے کہنے سے کلیجہ کانپتا ہے۔ اس کے بعد جب انگریز پنجاب کی مدد لیکر دہلی پر آئے اور اس کو مغلوب کر لیا تو بادشاہ سمیت سارا شہر بھاگ نکلا۔ میری والدہ نابینا تھیں اور آئے دن کی بیماریوں سے بہت کمزور ہو گئیں تھیں۔ رتھ میں سوار ہونا بھی اِن کو دوبھر تھا۔ مگر دو عورتوں کی مدد سے میں نے اِن کو سوار کیا اور خود بھی اُس میں بیٹھکر دہلی سے نکلا۔ بادشاہ وغیرہ تو مقبرہ ہمایوں گئے تھے۔ مگر میں نے کرنال کا رخ کیا کیونکہ وہاں میرے ایک دوست رہتے تھے جن سے دہلی میں اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی اور وہ کرنال کے علاقہ میں صاحب حیثیت زمیندار تھے۔

ہمارا رتھ اجمیری دروازہ سے باہر نکلا (راستہ تو لاہوری دروازہ سے تھا مگر اُدھر انگریزی فوج کا ڈر تھا) تو دیکھا ہزاروں آدمی عورت مرد بچے بوڑھے بقچیاں سروں پر رکھے حیران پریشان چلے جارہے ہیں۔ رتھ والے نے کہا گوڑگانوہ ہوکر کرنال چلنا

چاہیے۔ تاکہ فوج والوں کے ہاتھ سے امن رہے گوڑگانوہ تک تو ہم امن سے چلے گئے اگرچہ راستہ میں گوجر وغیرہ ملے۔ مگر ہم چیلے حوالے کر کے ان کے ہاتھوں سے بچ گئے لیکن گوڑگانوہ سے جب کرنال کی طرف مڑے تو دو کوس کے بعد ہی گوجروں کے ایک غول نے رتھ کو گھیر لیا اور لوٹنا چاہا۔ ابھی اُنہوں نے ہاتھ نہ ڈالا تھا کہ سامنے سے ایک انگریزی فوج کا دستہ آگیا۔ یہ سب گورے تھے۔ اِن کو دیکھکر گوجر تو بھاگ گئے اور گورے گھوڑے دوڑا کر رتھ کے پاس پہنچے۔ اور اُنہوں نے مذاق کے انداز سے انگریزی زبان میں کچھ کہنا شروع کیا۔ جس کو میں نہیں سمجھا۔ میں مشرقی رُخ تھا۔ مغربی رخ سے ایک گورے نے رتھ کا پردہ اُٹھا کر دیکھا اور والدہ کو نابینا اور بڑھیا دیکھکر قہقہہ لگایا اور اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا جس کو سُنکر وہ سب آگے بڑھ گئے اور ہمکو کچھ تکلیف نہ دی۔

جب وہ چلے گئے تو ہم آگے بڑھے اور شام تک چلتے رہے۔ رات کو ایک گاؤں کے پاس قیام کیا۔ وہاں آدھی رات کو چور بیل کھول کر لے گئے۔ رتھ بان بھی کہیں غائب ہو گیا۔ صبح کو میں بہت فکرمند ہوا اور گاؤں والوں سے جا کر کرایہ کی گاڑی مانگی یہ جاٹ تھے۔ اِن کا چودھری میرے ساتھ آیا اور بولا گاڑی تو ہمارے گاؤں میں نہیں ہے۔ تم اپنی ماں کو ہمارے گھر میں ٹھیرا دو۔ دوسرے گاؤں سے گاڑی منگوا دینگے میں نے اس کو غنیمت سمجھا اور والدہ کو لیکر چودھری کے گھر میں چلا گیا۔ ہمارے پاس ایک پٹاری تھی اور ایک صندوقچہ اور ان دونوں میں اشرفیاں اور جڑاؤ زیور تھا چودھری نے گھر میں اُتار کر اور سب سامان رکھکر ایک آدمی کو دوسرے گاؤں سے گاڑی کے لئے بھیجا۔ تھوڑی دیر میں گاؤں والوں نے غل مچایا کہ انگریزی فوج آتی ہے۔ چودھری میرے پاس آیا۔ اور کہا جاؤ تم گھر سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ ہم بھی تمہارے ساتھ مارے جائیں گے۔ میں بہت گھبرایا اور چودھری سے کہنے لگا کہ اندھی ماں کو لیکر کہاں جاؤں۔ تم کو میرے حال پر ترس نہیں آتا۔ یہ سُنکر اُس جاٹ نے میرے

ایک مُکہ مارا اور کہا ہم تیرے لئے اپنی گردن کٹوا دیں۔ میں نے بھی اسکے تھپڑ رسید کیا۔ یہ دیکھتے ہی جاٹ جمع ہو گئے۔ اور ان سب نے ملکر مجکو خوب مارا۔ اور میں بیہوش ہو کر گر پڑا ہوش میں آیا تو ایک جنگل میں پڑا تھا۔ اور والدہ میرے سرہانے بیٹھی رو رہی تھیں۔

والدہ نے کہا وہ جاٹ تجھ کو اور مجکو ایک چارپائی پر اُٹھا کر یہاں ڈال گئے ہیں معلوم ہوتا ہے اُنھوں نے اسباب لوٹنے کا یہ بہانہ کیا تھا فوج وج کچھ نہ آئی تھی۔

وہ بڑا کٹھن وقت تھا جنگل بیابان دہوپ کی شدت ایک میں ایک میری نابینا آنکھوں سے محتاج ماں۔ چاروں طرف سناٹا اور دشمنوں کا ڈر۔ راستہ کی بےخبری اور زخموں کی دُکھن سونے پر سُہاگہ۔ والدہ نے کہا۔ بیٹا چلو۔ ہمت کر کے آگے بڑھو۔ یہاں جنگل میں پڑے رہنے سے کچھ فائدہ نہیں میں کھڑا ہو گیا۔ سر میں اور بازو پر زخم تھے پیروں پر بھی چوٹ آئی تھی۔ مگر اندھی ماں کا ہاتھ پکڑ کے راستہ چلنا شروع کیا کانٹے دار جھاڑیاں سارے میدان میں پھیلی ہوئی تھیں جنھوں نے بدن کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور پیروں کو لہو لہان کر دیا۔ والدہ ٹھوکریں کھا کھا کر گر پڑتی تھیں اور میں ان کو سنبھالتا تھا۔ مگر زخموں کی کمزوری سے مجھ میں بھی چلنے کی ہمت نہ تھی۔ دو وقت سے ہمنے کچھ کھایا بھی نہ تھا۔ غرض ایسا وقت کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔

جب دوپہر کا سورج سر پر آیا تو میرے سر کے زخم میں ایسی تکلیف ہوئی کہ میں چکرا کر گر پڑا۔ ہوش تھا مگر اُٹھنے اور چلنے کی طاقت نہ تھی والدہ نے میرا سر اپنے زانوں پر رکھ لیا اور یہ دعا مانگنی شروع کی۔

الٰہی مجھ پر رحم کر میرے گناہوں کو معاف کر دے اور میرے بچے کی جان کو بچا لے۔ خدایا یہ اندھی شہزادی تیرے آگے ہاتھ پھیلاتی ہے اسکو محروم نہ کر۔ ہمارا تیرے سوا کوئی نہیں ہے۔ آسمان زمین ہمارے دشمن ہیں۔ تجھ بن کس سے کہوں۔ تو جسکو

چاہے عزت دے جسکو چاہے ذلت دے کل ہم ملکوں اور
ہاتھی گھوڑوں اور لونڈی غلاموں کے مالک تھے آج اُنمیں
سے کچھ بھی ہمارے پاس نہیں کس برتے پر دنیا والے اس
فانی جہان میں جینے کی آرزو کرتے ہیں۔

توبہ ہے۔ گناہوں کی توبہ ہے۔ رحم۔ رحم۔ اے خدا رحم۔

اماں دعا مانگ رہی تھیں۔ کہ ایک گنوار اُدھر آنکلا اور اُس نے کہا۔ بوڑھیا تیرے
پاس جو کچھ ہو ڈالدے۔ والدہ بولیں بیٹا میرے پاس تو سوائے اس زخمی بیمار کے کچھ
بھی نہیں ہے۔ یہ سُنکر اُس گنوار نے ایک لٹھ والدہ کے سر پر مارا۔ لٹھ کے پڑتے ہی
والدہ کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی۔ اور اُنھوں نے کہا ہائے ظالم میرے بچے کو نہ ماریو
میں ہمت کر کے اُٹھا مگر پھر چکرا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ گنوار نے میرے اور
والدہ کے کپڑے اُتار لئے۔ مجھے ہوش آیا تو گنوار چلا گیا تھا۔ اور ہم دونوں بالکل
برہنہ پڑے تھے۔ والدہ دم توڑ رہی تھیں میں نے اِن سے پوچھا۔

اماں کیا حال ہے۔ اُنھوں نے اُکھڑی اُکھڑی آواز میں کہا۔ میاں مرتی ہوں
میاں کو خدا کے سپرد۔ آہ کفن بھی میسر نہ آیا۔ ارے گور بھی نہ ملے گی۔ میں شہنشاہ ہند
کی بھاوج ہوں۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ کہا اور مرگئیں۔ میں نے وہیں سے
ریتا سمیٹا اور اس بیکس کی لاش کو خاک میں چھپا دیا۔ اور خود بھی بمشکل گھسٹ
گھسٹ کر ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک فوجی سوار
وہاں سے گذرا اور مجھ کو دیکھ کر قریب آیا۔ میں نے سارا حال اس سے کہا
اُس نے کمر کا رومال کھولکر مجھ کو دیا۔ جس سے میں نے تہ بند باندھا۔ اس کے بعد
اس سوار نے مجھ کو اُٹھا کر گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ اور اپنی چھاؤنی میں
لیگیا۔ وہاں اُس نے میرا علاج کرایا جس سے میرے زخم اچھے ہوگئے۔ پھر میں

اس کی خدمت کرنے لگا۔ یہ مسلمان سوار بہت ہی نیک مزاج تھا۔ اس کا مکان
پٹیالہ میں تھا۔ اس کے ہمراہ کچھ دن تو میں پٹیالہ میں رہا اور پھر فقیر ہو کر شہر بہ شہر
پھرنے لگا۔ جب بمبئی پہنچا تو خیراتی قافلہ کے ساتھ مکہ معظمہ چلا گیا۔ اور وہاں دس
برس گذرے۔ پھر مدینہ شریف حاضری دی۔ اور وہاں بھی پانچ برس بسر کئے اسکے
بعد شام اور بیت المقدس کی زیارتیں کر کے حلب ہو کر بغداد شریف گیا دو
سال وہاں کاٹے۔ بغداد سے ایک میمن کے ہمراہ کراچی آیا اور وہاں سے دہلی
آگیا۔ کیونکہ دہلی کی یاد مجکو ہر جگہ بےچین رکھتی تھی۔

یہاں ریل پر میں نے مزدوری کرنی شروع کی جس میں مجھ کو کھانے پینے کے
بعد کچھ بچت ہونے لگی۔ اور دو سال میں میرے پاس تین سو روپے ہو گئے
تو میں نے ایک ٹھیلہ والے کی شرکت میں ٹھیلہ بنایا اور اس کی آمدنی سے آہستہ
آہستہ ساجھی کا حصہ ادا کر کے اپنا مستقل ذاتی ٹھیلہ بنالیا۔ اور اب اسی پر
میری گذراوقات ہے۔

سائل نے کہا۔ بہرا پن کب ہوا۔ اور اس سے تو آپ کو تنہائی میں بہت تکلیف
اٹھانی پڑتی ہوگی۔ شہزادہ نے ہنس کر جواب دیا۔ خدا کا شکر ہے کچھ تکلیف
نہیں ہوتی۔ سارے جہان کے عیب سننے سے کان بند ہیں۔ گاؤں میں جب
جاٹوں نے مارا تھا۔ اسی وقت دماغ پر ایسی چوٹ آئی تھی جس سے کان کی
قوت جاتی رہی اب صرف بائیں کان سے کچھ سن سکتا ہوں۔ دایاں بالکل بیکار ہے
سائل نے یہ ماجرائے عبرت سنکر کہا کیا میں اس کو اپنی کتاب میں لکھدوں
شہزادہ نے کہا ضرور لکھدو مگر یہ بھی لکھدینا۔ کہ

ہر گذرنے والی بات اور ہر گذرنے والا وقت اور ہر
گذرنے والی راحت و تکلیف جھوٹی اور بے اصل ہے

مگر اس میں عبرت ضرور ہے

دسواں فسانہ

فقیر شہزادہ کی دولت

عطر اور دو انڈے

تم ہیرے کو چاہو۔ موتی پر جان دو۔ سونے چاندی کو سرمایۂ زندگی سمجھو شال دوشالے۔ زربفت۔ کمخواب سے جی لگاؤ۔ ہاتھی، گھوڑے، پالکی، نالکی محل حویلی کو ضروری خیال کرو۔ تم کو مبارک۔ مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ جو ان مٹنے والی چیزوں کو دو کوڑی کا سمجھتے ہیں۔ اور آخرت کی نعمتوں کے آگے دنیا کی ان بہاروں کو نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔

خدا اپنی محبت جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اس میں امیر غریب بڑے چھوٹے کمین شریف کی قید نہیں ہے۔

دہلی کا قلعہ آباد تھا۔ تیموری بادشاہ زندہ تھے اُس وقت کا ذکر ہے۔ بہادر شاہ بادشاہ کے عزیزوں میں ایک شہزادہ کو اللہ اللہ کرنے کی لگن لگ گئی۔ گھر میں خدا نے لونڈی غلام نوکر چاکر ہاتھی۔ گھوڑے سب کچھ دیا تھا۔ مگر یہ اللہ کا بندہ سب سے الگ مکان کے ایک کونے میں پڑا رہتا۔ دو جَو کی روٹیاں اس وقت دو اُس وقت کھاتا مٹی کے آبخورہ میں پانی پیتا۔ اور یادِ حق میں مصروف ہو جاتا۔

البتہ صاف کپڑے اور عطر کا بہت شوق تھا۔ ایک صندوقچہ میں طرح طرح کے عطر بھرے رکھے رہتے تھے۔ جن سے ہر نماز کے وقت ایک نئے عطر سے کپڑے

بساتے اور خدا کے سامنے مضطر ہو کر ہاتھ باندھتے۔

دنیا میں اِن کو اولاد سے۔ مال سے، کنبہ سے۔ رشتہ سے محبت نہ تھی۔ بس دو چیزوں پر جان دیتے تھے۔ ایک عطر اور ایک سبز وار مرغی کا جوڑا۔

عبادت سے فارغ ہوتے تو باہر آکر سبز وار مرغی کے جوڑے کو دانہ پانی دیتے اس کو دیکھکر کبھی ہنستے۔ کبھی روتے شاید ان کو خدا کی قدرتیں یاد آتی ہونگی۔ اور وہ ان مرغیوں میں کوئی جلوۂ الٰہی مشاہدہ کرتے ہونگے۔

غدر کی بھاگڑ

جب ۱۸۵۷ء کا غدر پڑا۔ اور سب دہلی والے شہر سے نکلے۔ بادشاہ اور اُنکی بیگمات وشہزادوں نے بھی قلعہ چھوڑا۔ تو یہ فقیر شہزادہ بھی مصلےّ بغل میں دبا کر کھڑے ہو گئے نوکروں نے عرض کی۔ جواہرات اور اشرفیاں ساتھ لے لیں۔ بولے یہ سب کچھ تم کو بخشا۔ ہم کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا نام کافی ہے۔ یہ کہا اور اپنا عطر کا صندوقچہ اور سبز وار مرغیوں کے دو انڈے لیکر چل کھڑے ہوئے۔

لوگوں نے سمجھایا۔ صاحب عالم یہ کیا غضب کرتے ہو۔ کھانے پینے کا سہارا ساتھ لینا چاہیئے۔ یہ عطر اور انڈے کس کام آئینگے۔ روپیہ پیسہ لو جس سے گزرا وقات ہو۔ مگر انھوں نے کسی کا کہا نہ مانا۔ اُن کے ایک چھوٹی لڑکی اور ایک بیوی تھیں۔ اُن کو نوکروں کے سپرد کیا اور کہا ان کے ساتھ رہو۔ جہاں یہ چاہیں ان کو ساتھ لیجاؤ۔ گھر میں جو کچھ نقدی ہے لے لو۔ خواہ تم رکھو خواہ اِن عورتوں پر خرچ کرو۔ مجھے نہ بیوی کا ساتھ دینا ہے نہ لڑکی کا۔ اور نہ روپیہ پیسے کا۔

بیگم اور بیگم زادی کی بپتا

فقیر شہزادہ عطر اور انڈے لیکر سیدھے درگاہ حضرت محبوب الٰہی رضی میں آگئے

اور درگاہ کے باہر ایک کھنڈر مکان میں بیٹھ گئے۔ ایک دیسی مرغی کا جوڑا خریدا اور وہ دونوں انڈے ان کے نیچے بٹھا دیئے اور یاد حق شروع کر دی کوئی روٹی دے گیا کھالی ورنہ بھوکے پڑ رہے۔ ہاں نماز پڑھتے تو عطر لگا کر پڑھتے۔ کیونکہ ان کے صندوقچہ میں عطر بہت تھا۔

نوکر بیگم اور بیگم زادی یعنی ان کی بیوی اور لڑکی کو لیکر گوڑگانوہ چلے گئے اور وہیں کے پاس سُہنہ قصبہ میں ایک مکان لے کے رہنے لگے۔

چند روز تو ان نوکروں نے ان بیکس عورتوں کی خدمت کی۔ لیکن چونکہ روپیہ پیسہ سب نوکروں کے ہاتھ تھا ان کو طمع دامنگیر ہوئی اور ایک دن عورتوں کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اور نقدی ساتھ لے گئے۔

بچاری شہزادی جو سویرے اُٹھیں۔ اور نوکروں کو آواز دی تو کوئی نہ بولا باہر جھانک کر دیکھا تو میدان صاف پایا۔ بہت روئیں۔ ہراساں ہوئیں۔ اب نہ کوئی آٹا لانے والا تھا۔ نہ پانی بھرنے والا۔ اور نہ کچھ پاس تھا۔ جس کو خرچ کر کے کچھ منگاتیں

لڑکی کی عمر چھ برس کی تھی اور وہ معصوم جانتی نہ تھی کہ اس پر اور اس کے خاندان پر کیا بلائیں نازل ہو رہی ہیں۔ چارپائی سے اُٹھتے ہی سب سے پہلے حلوا مانگتی تھی اور بیگم سویرے سے تیار رکھتی تھیں۔ آج نوکر نہ تھے۔ سودا کون لاتا۔ اور حلوہ کہاں سے پکتا لڑکی نے رونا شروع کیا۔ وہ مچلنے لگی۔ اور اپنی غریب ماں کی پریشانی کو دوگنا کر دیا۔

مایوس بیگم نے پڑوسی کے ایک سقہ کو آواز دی۔ اور اپنے ہاتھ کے طلائی کڑے دیکر کہا ان کو فروخت کر کے کھانے کا سامان لادو۔

سونے کے کڑے دیکھ کر سقہ کے مُنہ میں پانی بھر آیا چپکے سے لیلئے اور دو چار روپیہ کا آٹا۔ گھی۔ شکر وغیرہ لادی۔ بیگم نے باقی روپے مانگے تو بولا۔ جس بنیہ کے ہاتھ کڑے بیچے ہیں اُس نے باقی دام ابھی دیئے نہیں۔ بیگم خاموش ہو گئی۔

رات کو سقہ نے بیگم کے گھر میں آکر جبکہ وہ سوتی تھیں سارا اسباب کپڑے لتے سمیٹ لئے اور چل دیا۔ صبح کو بیگم اُٹھیں تو بہت روئیں۔ محلہ والوں کو پکارا۔ معلوم ہوا سقہ پڑوس سے کہیں چلا گیا یہ کام اُسی کا ہوگا۔ اُس وقت اُنھوں نے کڑوں کا حال بھی بیان کیا۔ ایک گھوسی کی عورت نے ترس کھا کر کہا۔ بیوی اب میں تیرے پاس رہا کرونگی۔ تو گھبرا مت۔

بیگم کے پاس ان کڑوں کے سوا اور کچھ زیور نہ تھا۔ چند دن تو رکھے ہوئے آٹے سے گزارا ہوا۔ اس کے بعد گھوسن نے اپنے پاس سے کھلایا۔

ایک دن گھوسن کے لڑکے نے ننھی بیگم کو دھکا دیدیا۔ جس سے ننھی کی بھوں پھٹ گئی اور بہت خون بہا۔ بیگم کی ایک ہی لڑکی تھی۔ اس نے گھوسن زادہ کو بُرا بھلا کہا۔ اسپر گھوسن بگڑی اور کہا ہمارے احسان کو بھول گئی۔ ہمارے ٹکڑے کھاتی ہے اور ہمیں کو آنکھیں دکھاتی ہے۔ بیگم سے یہ طعنہ نہ سُنا گیا اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"اری تو مجکو کیا روٹی کھلائیگی۔ میں اُس باپ کی بیٹی ہوں۔ جو سارے ہندوستان کے راجہ نوابوں کو روٹی کھلاتا تھا۔ جس کے دروازہ پر ہاتھی جھولتے تھے۔ جو ہر بیکس کا والی اور پشت پناہ تھا۔ آج اگر میں تباہ ہوگئی تو کیا میری شرافت بھی جاتی رہی۔ میں تیرے طعنے نہ سہوں گی۔ اور آج سے تیری روٹی نہیں کھاؤں گی۔ تیرے بچے میری لاچار بچی کو لہولہان کریں اور میں چپکی بیٹھی دیکھوں۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ تو نے جے دن روٹی کھلائی ہے میں اس کا بدل کر دوں گی اور جب خدا میرے دن پھیرے گا تیرا تمام بوجھ اُتار دونگی۔

خواب کا سانپ

اُس دن غم میں بیگم نے کچھ نہ کھایا۔ اور بچی زخم کی تکلیف میں پڑی رہی۔ اُس نے بھی کھانے کو کچھ نہ مانگا۔ رات کو بیگم نے خواب دیکھا کہ مجھ کو ایک سانپ نے نگل لیا اور اس کے اندر ایک باغ لگا ہوا ہے۔ باغ میں ایک تخت پر اس کے شوہر فقیر شہزادے بیٹھے ہیں اور ان کی

لڑکی اپنے سر کا زخم ان کو دکھاتی ہے اور کہتی ہے۔ دیکھو ابا گھوسن کے لڑکے نے میرا سر پھوڑ ڈالا۔

اس پر فقیر شہزادہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ دو فرشتے آسمان سے اترے اور انھوں نے ایک سانپ لڑکی کے گلے میں ڈال دیا۔ بیگم یہ دیکھکر ڈریں۔ اور چیخیں۔ ہے ہے میری بچی یہ کہتے ہی آنکھ کھل گئی۔ تو سُنا دروازہ پر کوئی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے۔ انھوں نے کہا کون ہے آواز آئی تمہارا خاوند۔

بیگم حیران ہو گئی۔ آواز واقعی فقیر شہزادہ کی تھی۔ کنڈی کھولدی وہ اندر آئے اور کہا چلو گاڑی تیار ہے بیگم نے کہا۔ کہاں چلوں اور تم کہاں سے آگئے۔ اس کا انھوں نے کچھ جواب نہ دیا لڑکی کو گود میں اٹھالیا اور بیگم کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا وہ چپ چاپ انکے ہمراہ ہو گئیں۔ باہر گاڑی کھڑی تھی اس میں سوار کرکے درگاہ محبوب الٰہی میں آگئے۔

جب یہاں پہنچے تو ایک مکان میں بیگم اور لڑکی کو اتارا اور خود باہر چلے گئے۔ بیگم نے دیکھا مکان میں ضرورت کی سب چیزیں مہیا ہیں۔ اور ایک صندوقچہ رکھا ہے۔ اس کو جو دیکھا تو دو ہزار روپیہ کی اشرفیاں اسمیں تھیں۔

بیگم کو بہت تعجب تھا کہ فقیر شہزادہ شہنہ پہنچے۔ اور یہ سب سامان کہاں سے آگیا۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص نے آواز دی۔ کہ تمہارے شوہر کا جنازہ تیار ہے۔ لڑکی کو صورت دکھادو تاکہ اس کے بعد ہم ان کو دفن کریں۔ مجھے اوخلجان ہوا کہ ابھی انکو گئے ہوئے آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ مر کب گئے۔

بیگم نے پکارنے والے سے کہا۔ تم کون ہو اور میرے شوہر کب مرگئے۔ اس نے کہا اس کا حال مجھے معلوم نہیں۔ کہ میں کون ہوں فقیر شہزادہ صاحب کی یہ وصیت تھی کہ میں انکی میت انکی لڑکی کو دکھاؤں بیگم نے لڑکی کو ساتھ کیا۔ اور خود کلیجہ تھام کر بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر میں لڑکی واپس آئی۔ اور کہا ابا جانی مرگئے۔ ان کو قبر میں گاڑ دیا۔ لڑکی

کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ شخص پھر آیا۔ اور آواز دی۔ اور کہا۔ مُہنہ والی گھوسن کو انعام دیدیا گیا۔ اب اسکا تم پر کوئی احسان باقی نہیں۔

تم کو جب تک یہ بچی جوان ہو چالیس روپے ماہوار خرچ کے لئے ملیں گے اسکے بعد تم مرجاؤگی اور یہ لڑکی اپنے خاوند کے ہاں چلی جائیگی۔

بیگم کو یہ عجیب باتیں برداشت نہ ہوئیں وہ غش کھاگر پڑیں۔ اور جب ہوش آیا تو ایک ماما کو بیٹھا پایا۔ جس نے کہا تم میرے ساتھ اٹھو اور چلو۔ میاں نے وہاں تمہارے لئے گھر لیا ہے۔ اٹھو چلو گھر میں سارا حال بیان کرونگی چنانچہ بیگم ماما کے ساتھ اٹھو گئیں اور اچھے گھر میں انکو اتار اگیا۔ اس وقت ماما نے کہا۔

فقیر شہزادہ صاحب کا ایک روحانی مؤکل تابع تھا۔ جس دن تمہاری لڑکی کے چوٹ لگی۔ اسی دن تمہارے شوہر نے انتقال کیا۔ یہ سارا سامان جو تم نے دیکھا اسی مؤکل کا ہے اور لو دیکھو کہ میں وہی مؤکل ہوں تم آرام سے یہاں رہو میں تمہاری خدمت کرونگا اور جب لڑکی کی شادی ہو جائیگی تو میرا کام ختم ہو جائیگا۔

لڑکی کو میں نے ہی اُسکے باپ کی میت قبر کے اندر مرحوم کی وصیت کے مطابق دکھائی تھی یہ کہکر ماما غائب ہو گئی اور بیگم کو لڑکی کی شادی تک غیبی آدمی خرچ پہنچاتا رہا۔ لڑکی کی شادی کے بعد بیگم مر گئیں اور غیبی مؤکل کا کام ختم ہوا۔

گیارہواں فسانہ

دُکھیا شہزادی کی کہانی

ننھی شہزادی کے دو ہاتھ لیڈی ہارڈنگ کی تصویر پر رکھے ہیں
امتحان۔ یہ صورت اُنہی ویسرائن کی ہے۔ جنہوں نے ہم کو ایک ہزار روپے دیئے۔

ہاں۔ بیٹی یہ بڑے لاٹ صاحب کی بیوی کا فوٹو ہے۔ بڑی رحمدل ہیں۔ ہمیشہ غریبوں پہ ترس کھایا کرتی تھیں۔ اب کے ہم بے سہاروں کا بھی خیال آگیا۔

ذرا اس تصویر کو مجھے دینا۔ میں ان بیگم کی بلائیں لوں۔ واری جاؤں۔ اور دو باتیں کرکے جی کی بھڑاس نکالوں۔

بھولپن کی باتیں

میں صدقے تم بڑی اچھی آدمی ہو۔ میں قربان۔ کیا نورانی صورت ہے۔ مگر تم ہم غریبوں کے جھونپڑے میں کیونکر آئیں۔ ہمارے ہاں تو ٹوٹے بوریہ کا فرش بھی پورا نہیں ہے میں تمکو کہاں بٹھاؤں۔ ہم کو چارپائی بھی میسر نہیں۔ ہم سب زمین پر سوتے ہیں۔ یہ بہت ٹھنڈی ہے۔ تم کو نزلہ نہ ہوجائے۔ ہمارے مکان کی کڑیاں بھی جھکی ہوئی ہیں۔ ایسا نہ ہو گر پڑیں میں تمہاری کیا خاطر کروں کیا چیز دسترخوان پر چنوں۔ پرسوں سے ہم نے کچھ نہیں کھایا۔ ابا میاں کو بنئے نے آٹا قرض نہیں دیا۔ اس وقت بھوک کے مارے میری عجیب حالت ہے اگر گھر میں کچھ ہوتا تو میں سب تمہارے سامنے رکھدیتی۔ میں بھوکی رہتی تم کو کھلاتی۔ کیونکہ تم نے ہم پہ احسان کیا ہے۔ اور اس وقت ہمکو یاد کیا ہے جبکہ سارا جہان ہم کو بھول گیا تھا۔

کیوں بیگم! تمہارا جی اس اندھیرے گھر میں گھبراتا تو نہیں۔ تم تو بجلی کی روشنیوں میں رہتی ہو۔ کیا کروں۔ آج ہم کو مٹی کا چراغ بھی نصیب نہیں ورنہ اسی کو روشن کردیتی تم کو کہاں سلاؤں۔ رات کیونکر گزرے گی۔ ہمارے پاس فقط دو پھٹے ہوئے کمبل ہیں ایک ابا میاں اوڑھتے ہیں اور ایک میں اماں مجکو ساتھ لیکر سوتی ہیں۔

میرے پیارے لاٹ صاحب کی بیگم! اچھی ذرا میرے ہاتھوں اور منہ کو دیکھو سردی سے پھٹ گئے ہیں۔ سردی کی راتیں پہاڑ ہو جاتی ہیں۔ سکھ کی نیند ہمارے خوابوں میں بھی آتی تھی تم نے ہم کو ہزار روپے دیئے ہیں۔ میں ہزار بار اپنے ہاتھوں سے تمہاری چٹ چٹ بلائیں

ئوں۔ اماں کہتی ہیں۔ ایک زمانہ ہمارا بھی تھا۔ ہم بھی ہزاروں روپے غریبوں محتاجوں کو بانٹا کرتے تھے۔ ہمارے گھروں میں بھی اونی قالین اور مخملی فرش تھے۔ ریشمی زرین پردے تھے سونے چاندی کی جڑاؤ چھتیں تھیں۔ شال دوشالے تھے۔ لونڈی غلام تھے۔ محل تھے ہندوستان کی شہنشاہی میں داخل تھے۔

ہمارے سامنے بھی گردنیں جُھکتی تھیں، راجہ مہاراجہ اشارہ کے منتظر رہتے تھے۔ ہمارے گھروں میں بھی کافوری شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ ہم بھی لاچارا ور بے سہاروں پر ترس کھاتے تھے۔ دوسروں کی خاطر اپنا گھر لٹاتے تھے۔ ہمارے جلوس میں بھی نقارے بجتے تھے نقیب کرکے تے۔ ہاتھی جھوم جھوم کر چلتے تھے۔ ہمارے سر پر بھی تاج تھا۔ تلواریں ہمارے قدموں پر سر ٹیک کر چلتی تھیں۔ توپیں ہماری ہوں پر گرج گرج کر برستی تھیں۔

لیکن بیگم اب وہ وقت کہاں ہے۔ دنیا ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ ؎

اُونچے اُونچے مکان تھے جنکے بڑے　　آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے ہا　　نہ کبھی دہوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے　　اُستخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے

ذاتِ معبود جاودانی ہے
باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

خدا نے ہم کو نعمت دی جب تک اُس کے قابل رہے نعمت پاس رہی اور جب ہمارے عمل خراب ہوئے عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ ملک سے بے خبر ہو گئے۔ مظلوموں کو بھول گئے۔ ظالموں کی چرب زبانیوں پر پھول گئے۔ خدا نے وہ دولت چھین لی۔ اور دوسروں کو دیدی۔ ہم کو اس میں کسی سے شکوہ نہیں۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

ہاں تم میری ماں کے برابر بلکہ اِن سے بھی بڑی ہو۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں یہاں بھی نہ بولوں تو کہاں زبان کھولوں۔ خدا نے تم کو ہم سب کا رکھوالا بنایا ہے۔ دیکھو تو

بھوک پیاس ہمکو ستاتی ہے۔ ہمارے ایسے دن خاک میں ملاتی ہے۔ میری عمر ایسی تھی۔ کہ چہرہ لال ہوتا۔ مگر فاقوں نے زرد کر دیا ہے۔ ہمارے گھر میں عید بقر عید کی خوشی بھی نہیں آتی۔ ہم کو ان دنوں میں بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ ہم اس دن بھی ٹوٹی ہوئی جوتیاں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں جس دن ساری دنیا اپنی اپنی حیثیت کے جوجب نئی جوتیاں اور نئے کپڑے پہنتی ہے۔ ہم برساتی ٹپکے کے کھٹکے رات دن لاتے ہیں ہمکو سردیاں جلا لے آتی ہیں۔ ہم پر گرمیاں قیامت ڈہاتی ہیں۔

دلی شہر کے کتے پیٹ بھر کر سوتے ہیں۔ کوے شکم سیر ہو کر گھونسلوں میں جاتے ہیں۔ چڑیوں تک کے واسطے بھی چھتوں کے گھر ہیں۔ گلہریاں بھی شاندار مکانوں میں رہتی ہیں۔ مگر تیمور بادشاہ کی اولاد۔ شاہجہاں بادشاہ کے بچے۔ جنہوں نے اس شہر کو فتح کیا۔ اور بنایا آدھی روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہوئے بھوکے سوتے ہیں انکو کوئی رات بے فکری کی نصیب نہیں ہوتی۔ جن کے باپ دادا نے لال قلعہ بنایا تھا۔ ان کو ٹوٹا جھونپڑا بھی میسر نہیں آتا۔

بھکارن شہزادی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر

بیگم تم نے دیکھا ہوگا۔ دلی شہر میں ایک جامع مسجد ہے جس کو ہمارے دادا شاہجہاں نے بنایا تھا۔ دور دور کی خلقت اس کو دیکھنے آتی ہے مگر اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے پھٹے ہوئے برقعہ کے اندر ننا تو ان بچے کو گود میں لئے پیوند لگا پاجامہ اور گھسی ہوئی کنے لگی جوتی پہنے کون عورت بھیک مانگتی ہے بیگم! یہ غریب دکھیا بیوہ شہزادی ہے جس کا کوئی وارث نہیں رہا۔ تم یقین کرنا۔ میری رحمدل ویسرائی اسی کے باپ شاہجہاں نے یہ مسجد بنوائی تھی آج پیٹ کے لئے بھیک کے ٹکڑے جمع کر رہی ہے تاکہ زندگی کی مسجد آباد کرے۔ مجھے شرم آتی ہے میں تم سے کیونکر کہوں کہ یہ ہزار روپے بہت تھوڑے

ہیں۔ مرہم کے ایک چھوٹے سے پھایہ سے کیا ہوگا۔ ہمارے تو سارے بدن پر زخم ہیں۔ تمہاری نئی دلی کی خیر جس کی سڑکوں میں لاکھوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ تمہاری نئی عمارتوں کی خیر جن کے واسطے کروڑوں روپیہ کی منظوری ہے۔ تمہارے اس نیک خیال کی خیر جس کی بدولت دلی کی پرانی عمارتوں کی مرمت ہو رہی ہے۔ اور بے شمار روپیہ اس میں خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے پیٹ کی نامراد سڑکوں کی بھی مرمت کرادو۔ اور ہمارے ٹوٹے ہوئے دلوں پر بھی عمارتیں چنوا ؤ۔ ہم بھی پرانے زمانہ کی نشانیاں ہیں ہمکو بھی زندہ آثار قدیم میں لوگ سمجھتے ہیں۔ ہم کو بھی سہارا دو۔ مٹنے سے بچاؤ۔ خدا تم کو سہارا دیگا اور بچائیگا۔

یہ کہتے کہتے دکھیا شہزادی چونکی۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ملا۔ اور کہا میں بھی کیا دیوانی ہوں۔ تصویر سے باتیں کرتی ہوں کاغذی بت کے آگے مرادیں مانتی ہوں۔ مگر شاید کسی خدا کے بندے کے کان تک یہ دیوانہ پن کی باتیں پہنچ جائیں اور وہ انگریزی میں ترجمہ کر کے خدا ترس ہارڈنگ بیگم کو یہ سنادے اور وہ اپنے خاوند لاٹ صاحب سے کہیں۔ کونسل کے ممبروں سے کہیں۔ بادشاہ سلامت اور انکی ملکہ سے کہیں۔ کہ آل شاہجہاں کی حفاظت کے لئے بھی نئی دلی کی دیگر منظوریوں کے ساتھ کوئی شاندار اور مصیبت شکن منظوری ہونی چاہیئے۔ [1]

دکھیا شہزادی کی کہانی

جس ننھی شہزادی کا یہ خیالی قصہ لکھا گیا ہے اُس کی ماں پر غدر کے زمانہ میں بڑی بپتا پڑی تھی۔ اس لئے وہ سچا اور اصلی قصہ بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔ وہ کہتی تھیں

[1] لیڈی ہارڈنگ مرحومہ نے اس تحریر پر توجہ کر کے غریب شہزادوں کی مدد فرمادی تھی۔ حسن نظامی

میری عمر سات برس کی تھی۔ اماں مجھ کو تین برس کا چھوڑ کر مر گئیں تھیں۔ ابّا کے پاس رہتی تھی۔ چودہ برس کا میرا ایک بھائی جمشید شاہ نامی تھا۔ مگر ہاتھ پاؤں کی اُٹھان سے بیس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ ابّا جان نابینا ہو گئے تھے۔ اور ہمیشہ گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ ڈیوڑھی پر چار نوکر اور ایک داروغہ۔ گھر میں تین باندیاں اور ایک مغلانی کام کرتی تھیں۔ حضرت بہادر شاہ ہمارے رشتے کے دادا ہوتے تھے اور ہمارا سب خرچ شاہی خزانہ سے ملتا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک بکری پلی ہوئی تھی۔ ایک دن میں نے اس کے بچہ کو ستانا شروع کیا۔ بکری نے بگڑ کر میرے ٹکر ماردی۔ میں نے غصہ میں دست پناہ گرم کر کے بکری کے بچہ کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ وہ بچہ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

کچھ دن کے بعد غدر پڑا۔ بادشاہ کے نکلنے کے بعد ہم بھی ابّا کے ساتھ شہر سے نکلے پالکی میں سوار تھے اور جمشید بھائی گھوڑے پر ساتھ ساتھ تھے۔ دلی دروازہ سے نکلتے ہی فوج والوں نے پالکی پکڑ لی۔ بھائی کو بھی گرفتار کرنا چاہا۔ اُنھوں نے تلوار چلائی ایک افسر کو زخمی کیا آخر زخموں سے چور ہو کر گرے۔ سامنے دو نوکدار پتھر پڑے تھے۔ وہ آنکھوں میں گھُس گئے اور بھائی نے چیخیں مار مار کر تھوڑی دیر میں جان دیدی۔ بھائی کی بیقرار آواز سنکر ابّا میاں بھی پالکی سے نیچے اُتر آئے اور ٹٹول ٹٹول کر لاش کے پاس گئے اور پتھر سے سر ٹکرا کر لہو لہان کر لیا۔ یہاں تک کہ ان کا وہیں خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد فوج والوں نے ہمارا سب سامان لے لیا اور مجکو بھی پکڑ لیا چلتے وقت باپ اور بھائی کی لاش سے چمٹ کر خوب روئی اور انکو بے گور و کفن چھوڑ کر مجبوراً فوج کے ساتھ چلی گئی۔

ایک دیسی سپاہی نے افسر سے مجھے مانگ لیا اور اپنے گھر مجکو لے گیا جو پٹیالہ کی ریاست میں تھا۔

اس سپاہی کی بیوی بڑی بدمزاج تھی وہ مجھ سے برتن منجھواتی مصالحہ پسواتی جھاڑو دلواتی۔ اور رات کو پاؤں دبواتی۔

شروع شروع میں ایک رات دن بھر کی محنت سے تھک گئی تھی۔ پاؤں دابنے میں اونگھ آئی تو اس جلادنی نے دست پناہ گرم کر کے میری بھوں پر رکھدیا جس سے پلکیں تک جھلس گئیں اور بھوؤں کی چربی نکل آئی۔ میں نے ابا کو پکارنا شروع کیا کیونکہ مجھے اتنی سمجھ نہ تھی کہ مرنے کے بعد پھر کوئی نہیں آیا کرتا جب ابّا نے جواب نہیں دیا تو میں اس عورت کے ڈر کے مارے سہم کر چپ ہو گئی۔ لیکن اس پر بھی اس کو ترس نہ آیا اور بولی کہ پاؤں دبا۔ زخموں کی تکلیف میں مجکو نیند نہ آتی تھی اور پیر بھی نہ دب سکتے تھے۔ مگر قہر درویش برجان درویش۔ میں نے اسی حالت میں پاؤں دبائے۔

سویرے مصالحہ پیسنے میں مرچوں کا ہاتھ زخموں کو لگ گیا۔ اس وقت مجکو تاب نہ رہی اور زمین پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ مگر بے رحم عورت کو تب بھی کچھ خیال نہ آیا۔ اور بولی چل مکار کام سے دم چراتی ہے۔ یہ کہکر پسی ہوئی مرچیں زخموں پر مل دیں اس وقت مجکو مارے تکلیف کے غش آگیا اور رات تک ہوش نہ آیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو بچارا سپاہی میرے زخموں کو صاف کر کے دوا لگا رہا تھا۔

تھوڑے دن کے بعد سپاہی کی یہ بیوی مر گئی۔ اور اس نے نئی شادی کی جو مجھ پر بہت مہربان تھی۔ اسی کے گھر میں میں جوان ہوئی۔ اور اس نے میری شادی ایک غریب آدمی سے کر دی۔ دو برس تک میرا خاوند زندہ رہا۔ اسکے بعد مر گیا۔ بیوہ ہو کر میں دلی چلی آئی۔ کیونکہ وہ سپاہی بھی مر گیا تھا۔ اور اس کی بیوہ نے دوسری شادی کر لی تھی دلی میں آکر میں نے بھی اپنی قوم میں دوسری شادی کر لی۔ جس سے فقط ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

اس خاوند کی پانچ سو روپیہ ماہوار انگریزی سرکار سے پنشن تھی۔ مگر تنخواہ قرضہ میں چلی گئی

اور اب ہم نہایت عسرت اور تنگدستی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

بارہواں فسانہ

بچاری شہزادی کا خاکی چھپرکھٹ

گل بانو خدا رکھے پندرہ برس کی ہوئیں جوانی کی راتوں نے گود میں لینا شروع کیا مرادوں کے دن پہلو میں گدگدیاں کرنے لگے۔ میرزا دارا بخت بہادر ولیعہد سابق بہادر شاہ کی نور چشم ہیں۔ باپ نے بڑے چاؤ چونچلے سے پالا ہے اور جس دن سے وہ دنیا کو چھوڑ کر قبر میں گئے محل میں گل بانو کی ناز برداریاں پہلے سے بھی زیادہ ہونے لگیں۔ اماں کہتی ہیں۔ نگوڑی کے تیغے سے دل کو بہت صدمہ پہنچا ہے باپ کا ٹکڑا نہ کرے اسکی ایسی دلداری کرو کہ اُن کی محبتوں کو بھول جائے۔

ادہر دادا یعنی بہادر شاہ بادشاہ کا یہ عالم ہے کہ پوتی کے لاڈ میں کسی بات سے دریغ نہیں کرتے۔ نواب زینت محل ان کی لاڈلی اور منظور نظر بیوی ہیں۔ جواں بخت انہی کی پیٹ کا شہزادہ ہے۔ اگرچہ میرزا دارا بخت کے قبل از وقت مرجانے سے ولیعہدی کا منصب میرزا فخرو کو ملا ہے۔ مگر جواں بخت کی محبتوں کے سامنے ولیعہد کی بھی کچھ پرسش نہیں ہے اور زینت محل انگریزی حکام سے اندر ہی اندر جواں بخت کی تخت نشینی کے معاملات طے کر رہی ہیں۔ جواں بخت کی اس دھوم سے شادی ہوئی ہے کہ مغلوں کی آخری تاریخ میں اس کر و فر کی نظیر نہیں ملتی۔ غالب و ذوق سہرے لکھتے ہیں اور ان میں شعر بازی کی چشمک ہو جاتی ہے جسکا ذکر شمس العلماء آزاد دہلوی نے آب حیات میں کیا ہے اور غالب کو لکھنا پڑا ہے کہ مقطع میں آپڑی تھی سخن گسترانہ بات " ورنہ مجھے خدانخواستہ اُستادِ شاہ یعنی جناب ذوق

سے کچھ عداوت نہیں ہے۔

یہ سب کچھ تھا۔ اور جواں بخت اور زینت محل کے آگے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا مگر گل بانو کی بات سب سے نرالی تھی۔ بہادر شاہ کو اس لڑکی سے جو تعلق تھا اور جیسی سچی محبت اس یتیم لڑکی سے رکھتے تھے ایسی کیفیت زینت محل اور جواں بخت کو بھی میسر نہ تھی۔

پس اندازہ ہو سکتا ہے کہ گل بانو کس شان و شوکت و ناز و نعمت سے زندگی بسر کرتی ہو نگی۔ ہونے کو میرزا دارا بخت کے اور بھی بال بچے تھے۔ مگر گل بانو اور اس کی والدہ سے ان کو عشق تھا۔ گل بانو کی ماں ایک ڈومنی تھی اور میرزا اس کو تمام بیگمات سے زیادہ چاہتے تھے۔ جب وہ مرے ہیں تو گل بانو بارہ سال کی تھی۔ میرزا درگاہ حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی میں دفن ہوئے تھے جو دہلی سے چھ میل کے فاصلہ پر پرانی دہلی کے کھنڈروں میں واقع ہے۔ گل بانو مہینہ کے مہینہ ماں کو لیکر باپ کی قبر دیکھنے جایا کرتی تھیں۔ جب جاتیں قبر کو لپٹا کر روتیں اور کہتیں۔ آبا ہم کو بھی اپنے پاس لٹا کر سُلا لو۔ ہمارا جی تم بن گھبراتا ہے۔

جب گل بانو نے پندرہویں سال میں قدم رکھا۔ تو شباب نے بچپن کی ضد اور شرارتیں تو رخصت کر دیں مگر دلربائی کی شوخیاں اس ستم کی ڈھائیں کہ محل کا بچہ بچہ پناہ مانگتا تھا سونے کے چھپر کھٹ میں دو شالہ تانے سویا کرتی تھیں۔ شام کے چراغ جلے اور بانو چھپر کھٹ پر پہنچیں۔ ماں کہتیں۔ چراغ میں بتی پڑی لاڈو پلنگ چڑھی " تو وہ مسکرا کر انگڑائی اور جمائی لیکر سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو ماتھے سے سمیٹ کر کہتیں۔ اچھا بی تم کو کیا سونے ہی وقت کھوتے ہیں ہمارا کیا لیتے ہیں۔ تم ناحق کوئلوں پر لوٹی جاتی ہو۔ ماں کہتی نا بنو میں جلتی نہیں شوق سے آرام کرو خدا تم کو ہمیشہ سکھ نیند سُلاتا رکھے۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ زیادہ سونا آدمی کو بیمار کر دیتا ہے۔ تم شام کو سوتی ہو تو سویرے ذرا جلدی اُٹھا کرو مگر تمہارا تو یہ حال ہے کہ دس بج جاتے ہیں۔ سارے گھر میں دھوپ پھیل جاتی ہے۔ لونڈیاں

ڈر کے مارے بات تک نہیں کرسکتیں کہ بانو کی آنکھ کھل جائیگی۔ ایسا بھی کیا سونا۔ آدمی کو کچھ گھر کا کام بھی دیکھنا چاہیئے۔ اب ماشاء اللہ تم جوان ہوئیں۔ پرائے گھر جانا ہے اگر یہی عادت رہی تو وہاں کیونکر گزارا ہوگا۔

گل بانو ماں کی یہ تقریر سنکر بگڑتی اور کہتی۔ تم کو ان باتوں کے سوا کچھ اور بھی کہنا آتا ہے ہم سے نہ بولا کرو۔ نہیں ہم دوبھر ہوگئے ہیں تو صاف صاف کہدو۔ دادا حضرت (بہادر شاہ) کے پاس جارہیں گے۔

محبت کا مکتب

اسی زمانہ کا ذکر ہے۔ میرزا داور شکوہ شہزادہ خضر سلطان کا بیٹا گل بانو کے پاس آنے جانے لگا۔ قلعہ میں باہمی پردہ کا دستور نہ تھا۔ یعنی شاہی خاندان کے آپس میں پردہ نہ کرتے تھے اس واسطے میرزا داور کی آمد و رفت بے روک ٹوک ہوتی تھی۔

پہلے تو گل بانو ان کی بہن اور وہ ان کے بھائی تھے۔ چچا تایا کے دو بچے سمجھے جاتے تھے لیکن بعد میں عشق نے ایک اور رشتہ پیدا کیا۔ میرزا گل بانو کو کچھ اور سمجھتے تھے اور گل بانو داور کو ظاہری قرابت کے سوا کسی اور رشتہ کی نظر سے دیکھتی تھیں۔

ایک دن صبح کے وقت میرزا گل بانو کے پاس آئے تو دیکھا کہ بانو سیاہ دوشالہ اوڑھے سنہری چھپر کھٹ میں سفید پھولوں کی سیج پر پاؤں پھیلائے بے خبر پڑی سوتی ہیں۔ منہ کھلا ہوا ہے۔ اپنے ہی بازو پر سر رکھا ہے۔ تکیہ الگ پڑا ہے دونوں لونڈیاں مکھیاں اُڑا رہی ہیں۔

داور شکوہ چچی کے پاس بیٹھکر باتیں کرنے لگا۔ مگر کن انکھیوں سے گل بانو کا یہ عالم مخموری دیکھتا جاتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا۔ اور بولا۔ کیوں چچی (حضرت) بانو اتنے دن چڑھے تک سوتی رہتی ہیں۔ دھوپ قریب آگئی اب تو ان کو جگا دینا چاہیئے۔ چچی نے کہا بیٹا بانو کی

مزاج کو جانتے ہو کس کی شامت آئی ہے جو انکو جگائے آفت برپا ہو جائیگی۔
داورنے کہا دیکھئے میں جگاتا ہوں۔ دیکھوں کیا کرتی ہیں۔ چچی ہنسکر بولیں جگا دو تم سے کیا کہیں گی۔ تمہارا تو بہت لحاظ کرتی ہیں۔ داورنے جاکر تلوے میں گدگدیاں کیں۔ بانو نے انگڑائی لیکر پاؤں سمیٹ لیا۔ اور بے اختیار آنکھیں کھول کر نگاہ طیش سے پائنتی کی طرف دیکھا۔ اس کو خیال تھا کہ کسی لونڈی کی شرارت ہے اسکو گستاخی کی سزا دینی چاہیئے۔ مگر جب اس نے ایسے شخص کو سامنے کھڑا دیکھا جس سے خود بخود اس کا دل محبت کرتا تھا تو شرم سے اس نے دوشالہ کا آنچل منہ پر ڈال لیا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ داورنے ہوش پاش منظر کو دل تھام کر دیکھا اور بے اختیار چیخکر بولا۔ لو چچی حضرت میں نے بانو کو اٹھا بٹھایا۔
محبت نے بہت ترقی کی مکتب عشق کی ابجد ختم ہو گئی اور درس ہجر و وصل کے شکوے پڑھے جانے لگے تو گل بانو کی ماں کو شبہ ہوا اور اس نے داور شکوہ کا اپنے گھر میں آنا بند کر دیا۔

غدر کے نو مہینے بعد

درگاہ حضرت چراغ دہلی کے ایک گوشہ میں ایک قبول صورت عورت بیٹھا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت ہائے ہائے کر رہی تھی۔ سردی کا مہینہ دھواں دھار برس رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی جہاں اس عورت کا بستر تھا یہ عورت سخت بیمار تھی۔ پسلی کے درد۔ بخار اور بے کسی میں اکیلی پڑی تڑپتی تھی بخار کی بیہوشی میں اس نے آواز دی گلبدن۔ اری او گلبدن۔ مُردار مر گئی جلدی آ اور مجھ کو دوشالہ اُڑھا دے۔ دیکھ بوچھاڑ اندر آتی ہے پردہ چھوڑ دے روشنک تو ہی آ گلبدن تو کہیں غارت ہو گئی۔ میرے پاس کوئلوں کی انگیٹھی لا پسلی پر تیل مل اسے

درد سے میرا سانس رکا جاتا ہے۔

جب کوئی اس آواز پر بھی اس کے پاس نہ آیا۔ تو اُس نے کمبل چہرہ سے ہٹایا اور چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے دالان میں خاک کے بچھونے پر تنہا پڑی تھی چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مینہ سنائے سے برس رہا تھا بجلی چمکتی تھی تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ (جو اسکے باپ کی تھی)

یہ حالت دیکھکر اس عورت نے ایک آہ کا نعرہ مارا اور کہا بابا۔ بابا۔ میں تمہاری گل بانو ہوں۔ دیکھو اکیلی ہوں۔ اُٹھو مجھے بخار چڑھ رہا ہے۔ آہ میری پسلی میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میرے پاس اس بوسیدہ کمبل کے سوا اوڑھنے کو کچھ نہیں ہے۔ میری اماں مجھ سے بچھڑ گئیں۔ میں محلوں سے جلاوطن ہو گئی۔ بابا اپنی قبر میں مجھکو بلالو۔ اچھی مجھے ڈر لگتا ہے۔ تن سے منہ نکالو اور مجھکو دیکھو۔ میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میرے بدن میں اس گیلی زمین کے کنکر چبھتے ہیں۔ میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں۔

میرا چھپر کھٹ کیا ہوا۔ میرا دوشالہ کہاں گیا۔ میری سیج کدھر گئی۔ ابا۔ ابا۔ اٹھو جی کبتک سوؤ گے۔ ہائے درد۔ افوہ سانس کیونکر لوں۔

یہ کہتے کہتے اس کو غفلت سی ہو گئی۔ اور اُس نے دیکھا کہ میں مر گئی ہوں اور میرے والد میرزا دارا بخت مجکو قبر میں اُتار رہے ہیں اور رو رو کر کہتے ہیں

یہ اس بچاری کا خاکی چھپر کھٹ ہے

آنکھ کھل گئی اور بچاری بانو ایڑیاں رگڑنے لگی سکرات کا وقت شروع ہو گیا اور وہ کہتی تھی۔ لو صاحب میں مرتی ہوں۔ کون میرے حلق میں شربت ٹپکائیگا۔ کون مجھ کو یٰسین سنائیگا۔ کس کے زانو پہ میرا سر رکھا جائیگا۔ الٰہی تیرے سوا میرا کوئی نہیں

تو ایک ہے تیرا حبیب (صلعم) میرا مونس و رفیق ہے۔ اور یہ چراغ اولیا میری پڑوسی

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

شہزادی مر گئی۔ اور دوسرے دن گورغریباں میں گڑ گئی اور وہی اس کا ابدی چھپر کھٹ تھا جس میں قیامت تک سوتی رہے گی۔

تیرہواں فسانہ

غدر کی بنا غلط فہمیاں

خانم کا بازار دہلی میں مشہور مقام تھا جس کی آبادی قلعہ کے سامنے تھی اور جس میں بڑے بڑے مشہور صناع اور مختلف حرفتوں کے کاریگر رہتے تھے۔ غدر ۵۷ء کے بعد یہ محلہ جڑ بنیاد سے کھد گیا اور اب وہاں میدان کے سوا کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ اپریل ۵۷ء کا ذکر ہے۔ ایک دن شام کے وقت محمد یوسف سادہ کار لال ڈگی کی سیر کرنے گیا تو اس کو ایک ہندو جوہری کا ملازم ملا اور اس نے کہا کہ ہمارے لالہ کو ایک مندر کا طلائی کلس بنوانا ہے۔ اور انھوں نے تم کو اپنے مکان پر بلوایا ہے چلکر کام کا تخمینہ کر لو۔

محمد یوسف ایک مشہور چاندی والے دستکار کا لڑکا تھا۔ خاص بازار اور خانم کے بازار میں جتنے چاندی والے رہتے تھے وہ لاہوریوں کے نام سے مشہور تھے اور اب بھی ان کو لاہوری کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ چاندی کے برتن اور سونے کے زیور بناتے تھے اور ہتھیار سازی کا پیشہ بھی اسی قوم کے ہاتھ میں تھا۔ محمد یوسف کے باپ نقری

برتن بنانے میں استاد مانے جاتے تھے۔ اور محمد یوسف کو ملمع سازی کا کام سکھایا تھا
جوہری کے نوکر نے طلائی کلس کا نام لیا تو یوسف اُسکے ساتھ چلنے کو آمادہ
ہوا۔ مگر اس نے کہا کہ مغرب کی نماز پڑھکر چلونگا۔ وقت قریب آگیا ہے۔ نوکر نے کہا اچھا
میں ٹھیرا ہوا ہوں۔ تم نماز پڑھ لو۔ یوسف نے ایک مسجد میں جاکر نماز پڑھی اور باہر آکر نوکر
کے ساتھ ہولیا۔ نوکر اس کو مالی واڑہ میں لے گیا۔ جہاں ہندو جوہری آباد تھے۔ اور
یوسف اکثر اس محلہ میں کام لینے دینے جایا کرتا تھا۔

ایک گلی میں جاکر نوکر نے کہا۔ تم ذرا یہاں ٹھیرو میں ابھی آتا ہوں۔ یوسف کھڑا ہو گیا۔
اتنے میں چار آدمی ایک گھر میں سے نکل کر آئے۔ یہ بہت لمبے تڑنگے اور موٹے تازے
جوان تھے۔ ان چاروں کے ساتھ وہ نوکر بھی تھا۔ ان جوانوں نے یوسف سے کہا آیئے
اس مکان میں چلئے تاکہ ہم آپ کو کام دکھائیں۔ یوسف کو پہلے تو شک ہوا کہ یہ جوہری
نہیں ہیں خبر نہیں کیا بھید ہے۔ مگر پھر اس نے دل کو مضبوط کر کے خیال کیا کہ جو بھی ہوں
مجھے ڈرنا نہ چاہئے۔ اور وہ سیدھا ان کے مکان میں چلا گیا۔ وہاں ایک مولوی صاحب
بیٹھے تھے۔ جنھوں نے یوسف کو دیکھتے ہی سلام علیکم کی صدا بلند کی۔ یوسف کو اور بھی تعجب
ہوا۔ اور وہ وعلیکم السّلام کہکر فرش پر بیٹھ گیا۔ مولوی صاحب نے کہا میاں صاحبزادے
تم کو ہم نے ایک حیلہ سے بلایا ہے۔ مندر کا کلس بنوانا مقصود نہیں ہے بلکہ کچھ اور کام
ہے۔ میں اس شہر کا باشندہ نہیں ہوں اور یہ چاروں آدمی بھی پردیسی ہیں اور ہم سب ایک
ہندو جوہری کے مہمان ہیں جس نے ہم کو تمہارا پتہ بتایا ہے۔ ہمنے سُنا ہے کہ تمہارے
چچا ہتھیار سازی کا فن جانتے ہیں۔ اور دہلی کے میگزین میں ان کی آمد و رفت ہے
اور وہاں کا سب حال انکو معلوم ہے۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ انہی کو بلائیں مگر معلوم
ہوا کہ وہ بہت ڈرپوک آدمی ہیں۔ اس واسطے ہم نے تم کو بلانا مناسب سمجھا کیونکہ
تم بڑے ہمت والے ہو۔ جوہری صاحب کے لڑکے سے آٹھ دن پہلے جو باتیں تم نے

کی تھیں۔ اُن سے معلوم ہوا کہ تمہارے دل میں اپنے دین کی محبت ہے اور بے دین فرنگیوں کی حکومت سے تم خوش نہیں ہو۔ اِس واسطے میں یہ قرآن شریف تمہارے سامنے رکھتا ہوں اِس پر ہاتھ رکھکر قسم کھاؤ کہ ہمارا بھید کسی سے نہ کہوگے۔ اور جو کام تم سے کہا جائے اُس کو پورا کروگے۔

یوسف نے کہا میں قسم کہانے سے ڈرتا ہوں۔ یہ بہت بڑی قسم ہے اِس سے تو معاف کیجئے۔ البتہ اِس کا عہد کرتا ہوں کہ آپکا کام دینی ہوگا تو جان و مال سے اسکی مدد کرونگا

یہ جواب سُنکر اُن چاروں آدمیوں نے تلواریں سونت لیں اور کہا قسم نہ کھاؤگے تو جان کی خیر نہیں۔ ہم ابھی ذبح کر ڈالیں گے۔ مولوی صاحب نے ان چاروں کو خفگی کے لہجہ میں اِس حرکت سے روکا اور یوسف کو نرمی سے سمجھانے لگے۔

یوسف کچھ تو ڈرا اور کچھ اسپر مولوی صاحب کی باتوں کا اثر ہوا۔ اور فوراً قرآن شریف کو اُٹھا کر سر پر رکھ لیا اور بولا۔ میں ہر دینی کام کے لئے جو آپ بتائیں حاضر ہوں۔ خواہ میری جان جاتی رہے۔

مولوی صاحب نے یوسف کو سینہ سے لگا لیا اور فرمایا کہ ہمارا بس اتنا کام ہے کہ کسی طرح میگزین کے افسر تک پہنچو۔ اور اِس کے پوشیدہ کاغذات حاصل کرو کیونکہ ہمکو معلوم ہوا ہے کہ انگریزوں نے ہندوستانی سپاہیوں کا مذہب خراب کرنے کی تجویز کی ہے۔ سور اور گائے کی چربی سے کارتوس چکنے کئے ہیں۔ تاکہ جب سپاہی ان کو دانت سے کاٹیں تو ہندو مسلمان دونوں کا ایمان جاتا رہے۔

اگر یہ خبر سچ ہے تو افسر میگزین کے پاس اِس قسم کے کاغذ ضرور ہونگے ہم صرف ثبوت چاہتے ہیں۔ تاکہ ہمارا انتقام خدا کے نزدیک جائز ہو جائے۔ یہ چاروں آدمی ہندو ہیں۔ اور ایک فوج کے ملازم ہیں۔ اور مجھ کو ایک دوسری فوج کے مسلمان افسروں نے اِس کام پر مقرر کیا ہے۔

یوسف نے کہا۔ ایک خانگی وجہ سے میں چچا کے گھر میں نہیں جاتا۔ پھر کیونکر میگزین تک میری رسائی ہو سکے گی۔

مولوی صاحب مسکرا کر بولے۔ ہاں مجھے معلوم ہے کہ تمہاری منگنی تمہارے چچا کی لڑکی سے ہوئی ہے۔ اور اس وجہ سے تم ان کے گھر میں نہیں جاتے۔ مگر اس کام کے لئے گھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم چچا سے میل جول کر کے۔ انکے ساتھ میگزین جانا شروع کرو اور کسی طرح وہ کاغذ نکال لاؤ۔

یوسف نے کہا اگر ایسا کیا بھی جائے تو میگزین کے پوشیدہ کاغذوں تک رسائی پانا محال ہے۔ صاحب لوگ کاغذوں کو باہر تھوڑی ڈالے رکھتے ہیں۔

مولوی صاحب بولے۔ تم ابھی سے اگر مگر نہ کرو جاؤ تو سہی خدا مدد دیگا اور ہم بھی تم کو ترکیبیں بتاتے رہیں گے۔

یوسف بہت اچھا کہکر گھر چلا آیا اور اپنے عہد کے انجام کار پر غور کرنے لگا۔

میگزین کا دربان

رحیم بخش نامی میگزین کا ایک دربان تھا اس کو افسر میگزین کے خانگی کاروبار میں بھی بہت دخل تھا۔ یوسف جب اپنے چچا کے ساتھ میگزین میں آنے جانے لگا تو تیسرے دن رحیم بخش نے چپکے سے اسکو الگ بلایا۔ اور کہا تم جس فکر میں ہو اس میں میری مدد کی بہت ضرورت ہے۔ مولوی صاحب نے مجھ سے بھی حلف لیا ہے۔ مگر میں خود کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ صاحب کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ تم کو بتا سکتا ہوں کہ گوکھرو والے کوٹھے کے برابر جو کمرہ ہے اُس میں صاحب کے بکس رکھے ہیں اور کاغذات انہی میں رہتے ہیں پرسوں صاحب نے گوکھرو صاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ تمہارے چچا کاریگر [illegible] آئیں گے تم بھی آنا اور پشت کے دروازہ کا قفل کسی طرح کھول کر کمرہ میں داخل ہو جانا۔

یوسف اس بات سے بہت خوش ہوا کیونکہ اس کو اپنے خلف کی خدمت ادا کرنے کا سُراغ مل گیا تھا دوسرے دن وہ اپنے چچا کے ساتھ آیا اور جنگی گودام کا زنگ صاف کرنے لگا۔ اسی حالت میں اُس نے کمرہ کا دروازہ دیکھا جس میں ایک بھاری قفل پڑا ہوا تھا۔

دوپہر کو سب کاریگر کھانا کھانے اور ذرا آرام کرنے کے لئے میگزین سے باہر گئے مگر یوسف وہیں ٹھیرا رہا۔ پہرہ پر ایک ہندوستانی موجود تھا۔ رحیم بخش دربان نے موقع کی حالت دیکھی تو سنتری سے آ کر کہا کہ تیرے گھر سے ابھی ایک آدمی آیا تھا اور کہتا تھا کہ تیری بیوی کوٹھے سے گر پڑی ہے تو جلدی وہاں جا۔ میں یہاں موجود ہوں۔ تیری عوضی کے سپاہی کو ابھی بلا لونگا۔ سنتری یہ سُنکر فوراً چلا گیا۔ اور یوسف نے پھرتی کر کے آہنی اوزاروں سے جو گودام صاف کرنے کے لئے وہاں رکھے تھے قفل کھول لیا۔ اور کمرہ میں جا کر بکس کھولنا چاہا۔ مگر وہ بھی مقفل تھا۔ اس کو بہتیرہ کھولا۔ مگر وہ نہ کھلا۔ ناچار ہو کر قفل توڑ کر دیکھا تو بکس کے اندر کچھ بھی نہ تھا۔ یوسف نے جلدی سے دوسرا بکس توڑا اس میں چند کاغذات تھے۔ مگر وہ اتنے زیادہ تھے کہ اکیلے آدمی سے نہ چل سکتے تھے یوسف نے کچھ دیر سوچا کہ اب کیا کرے۔ آخر اس کے خیال میں یہ بات آئی کہ لفافوں کی شکل میں جسقدر کاغذ ہیں ان کو نکال لینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور کاغذوں کو رومال میں باندھکر باہر آ گیا۔ اور پھر کمرہ کو مقفل کر دیا۔

جب کاریگر کام پر آ گئے۔ تو یوسف میگزین سے نکلکر سیدھا مالیواڑہ گیا۔ اور مولوی صاحب کو وہ سب کاغذات جا کر دیدیئے۔ مولوی صاحب نے فوراً ایک محرر راز گماشتہ کو بلایا جو انگریزی پڑھا ہوا تھا۔ اور اس سے ان کاغذات کو پڑھوایا۔ تو ان میں کارتوسوں کے متعلق کوئی کاغذ نہ نکلا۔ ایک لفافہ میں صرف اس مضمون کا ایک خط ملا۔ جو میرٹھ سے آیا تھا۔ کہ "نئے کارتوسوں کے متعلق دہلی کے سپاہیوں میں کیا چرچا ہے"

حیدر

مولوی صاحب نے کہا بس معلوم ہو گیا۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ جب ہی تو دریافت کیا گیا ہے۔ یوسف نے کہا۔ اس میں تو کوئی شبہ کی بات نہیں ہے۔ مولوی صاحب بولے میاں ابھی تم بچے ہو۔ فریب کی باتوں کو کیا جانو۔ یہ کہکر اُنھوں نے فوراً سفر کی تیاری شروع کی۔ اور یوسف کو تسلی دیتے ہوئے دہلی سے کہیں چلے گئے۔

غدر شروع ہو گیا

آخر ۱۱ مئی کی تاریخ آگئی اور میرٹھ کی باغی فوج نے دہلی میں آکر غدر مچا دیا۔ انگریز قتل ہو رہے تھے۔ کوٹھیوں اور بنگلوں میں آگ لگ رہی تھی چاروں طرف غل شور اور لوٹ مار کا ہنگامہ گرم تھا۔ یوسف بھی اپنے گھر سے نکلکر قلعہ کے نیچے آیا۔ تو وہاں اس نے ایک سوار کو پہچانا۔ جو انہی چار آدمیوں میں سے تھا جو مالی واڑہ میں ملے تھے سوار نے کہا۔ آؤ یوسف تم سے ایک کام ہے۔ ہم سب میگزین پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ چلو ہمارے ساتھ چلو۔ اور سیر کرو۔ یوسف نے کہا میں وہاں جاکر کیا کرونگا میں سپاہی نہیں ہوں نہ میرے پاس ہتھیار ہیں۔ مگر سوار نے مجبور کیا اور کہا وہاں لڑائی نہ ہوگی۔ انگریز سب قتل ہو گئے یا بھاگ گئے اور دیسی فوج ساری ہمارے ساتھ شریک ہو گئی۔

یوسف یہ سُنکر سوار کے ساتھ کشمیری دروازہ تک گیا جب میگزین پر پہنچے تو اس کا دروازہ بند تھا۔ اور باغی فوج اس کو گھیرے ہوئے کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر میں دروازہ کی کھڑکی سے اسی رحیم بخش دربان نے جھانکا۔ اور کہا قلعہ سے زینے لے آؤ اور اوپر چڑھ کر اندر آؤ۔ یہاں صرف چند انگریز ہیں۔ یوسف نے رحیم بخش کے قریب جاکر پوچھا کہ کمرہ والی بات تو ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔ رحیم بخش نے کہا کہ غافل شرابیوں کو ابھی کچھ بھی معلوم نہیں ہوا ہے۔

سپاہی زینے لینے چلے گئے اور یوسف اپنے گھر واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک خوفناک دھماکا ہوا جس سے شہر کے در و دیوار لرز گئے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زمین پھٹ گئی اور سب اس میں دھس گئے۔ یہ آواز میگزین اُڑنے کی تھی۔ دہلی میں گولے اور گولیاں اس کثرت سے برسیں جیسے زور کی بارش اور اولے پڑتے ہیں۔ ہزاروں آدمی ہلاک و زخمی ہو گئے اور کئی گھنٹے دھواں چھایا رہا اور زخمیوں کی چیخیں بلند ہوتی رہیں۔

دہلی فتح ہو گئی

انگریزوں نے مصیبت کے چند مہینے کاٹ کر دوبارہ عروج حاصل کیا پنجاب کی سپاہ لیکر دہلی پر آئے اور خوں ریز معرکوں کے بعد دہلی کو دوبارہ فتح کر لیا۔

جس زمانہ میں دہلی پر گولہ باری ہو رہی تھی اور شہر کے سب باشندے بھاگ رہے تھے اُس وقت یوسف کے چچا نے۔ یوسف کے باپ سے کہا کہ انجام بُرا نظر آتا ہے بہتر یہ ہے کہ یوسف کا نکاح کر دیا جائے تاکہ جب ہم سب باہر نکلیں تو پردہ کی دقت نہ رہے یوسف کے باپ نے اس رائے کو پسند کیا اور یوسف کی شادی ہو گئی۔ مگر نکاح ہوتے ہی خبر ملی کہ انگریزی فوج دہلی میں داخل ہو گئی اور بادشاہ قلعہ سے نکل کر مقبرہ ہمایوں میں چلے گئے۔ یوسف کے والدین اور سب کنبے والے بھی رتھوں میں بیٹھکر بھاگے اور سیدھے قطب صاحب گئے۔ یوسف نے اس وقت تک دلہن کا چہرہ نہ دیکھا تھا قطب صاحب میں جہاں ٹھیرے وہ جگہ بہت خراب تھی۔ اور اتنی کہ اس کنبہ کا گزارا دشوار تھا۔ دستور کے موافق اس پریشانی میں بھی دلہن نے شرم و حیا کا لحاظ رکھا آدھی رات کو یہ لوگ سو گئے تو انگریزی سواروں نے ان کو گھیر لیا۔ اور یوسف کو تلاش کرنے لگے۔ یہ سب لوگ بیدار ہوئے تو سواروں نے سب مردوں کو گرفتار کر لیا۔ اور نام معلوم کر کے۔ یوسف اس کے باپ اور اس کے چچا کو ساتھ لے گئے۔ اور باقی آدمیوں کو چھوڑ دیا۔ جب وقت یوسف رخصت ہوا

تو اس کی ماں بے قرار ہو گئی۔ اور اس نے رو رو کر کہا کہ یہ میری بیس برس کی کمائی ہے یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہونگی۔ کل اس کی شادی ہوئی ہے اس نے تو ابھی اپنی دُلہن کو دیکھا بھی نہیں۔ تم اسے کہاں لئے جاتے ہو اور کیوں لئے جاتے ہو۔

ایک سوار نے جواب دیا کہ یہ بڑا باغی مجرم ہے۔ اس کو پھانسی دیجائیگی تم اس سے آخری ملنا مل لو کہ اب یہ دوبارہ تمہارے پاس نہ آئے گا۔

یہ سُنکر یوسف کی ماں نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔

یوسف کی بیوی ابھی تک گھونگٹ نکالے شرمائی ہوئی بیٹھی تھی۔ مگر سوار کی بات سُنکر اُس نے گھونگٹ اُٹھا دیا اور دونوں ہاتھ ملتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے ہونٹ شدت غم سے لرز رہے تھے۔ اس نے مُنہ سے تو کچھ نہ کہا صرف حسرت کی نگاہ سے یوسف کو دیکھا اور ٹکٹکی باندھ کر برابر دیکھتی رہی۔

یوسف مرد تھا مگر وہ بھی یہ نظارہ دیکھ کر بے تاب ہو گیا اور مایوس نظروں سے اپنی دُلہن کی حالت دیکھنے لگا۔ وہ بھی چپ تھا۔ دُلہن چُپ تھی۔ دُلہن کی آنکھوں کا سرمہ آنسوؤں کیساتھ بہہ بہہ کر سُرخ و سفید رخساروں پر دھبے لگاتا تھا۔ اور یوسف کے چہرہ کو بھی یاس و ہراس نے زرد اور خشک کر دیا تھا۔

یوسف اور اسکے باپ و چچا کے ہاتھ رسّی سے باندھ دئے گئے اور سوار انکو لیکر روانہ ہونے لگے۔ تو یوسف کی دلہن نے بہت دھیمی آواز سے کہا۔ "جاؤ میں نے مہر معاف کیا"

پھانسی کا وقت

تحقیقات سے ثابت ہوا کہ یوسف اور اس کا چچا میگزین کی سازش کے مجرم ہیں

یوسف کا باپ بے قصور ہے۔ اس لئے اس کو رہائی دی گئی۔ اور باقی ان دونوں کو پھانسی کا حکم ہوا۔

جیل خانہ میں جہاں یہ سب قیدی بند تھے۔ یوسف نے ان مولوی صاحب کو بھی دیکھا جو مالی واڑہ میں ملے تھے۔ اُنھوں نے یوسف کو صبر کی نصیحت کی اور فرمایا ان چار سواروں میں سے ایک نے ہم سب کی مخبری کی ہے یوسف نے کہا آپ کہاں چلے گئے تھے۔ اُنھوں نے کہا میں میرٹھ جا کر پھر دہلی آ گیا تھا۔ مخبر نے تمام واقعات کی اطلاع افسر کو دے دی۔ رحیم بخش دربان تو میگزین کے ساتھ اڑ گیا اور میں یہیں گرفتار کر لیا گیا۔

یوسف کے چچا نے اپنی مصیبت اور اپنی لڑکی کا قصہ مولوی صاحب سے کہا تو وہ بولے بے شک یہ حالات رنج کے ہیں۔ مگر ہم نے دین کے خیال سے یہ سب کچھ کیا تھا۔ کیونکہ ہمکو یقین تھا کہ انگریز ہم کو کرسٹان بنانا چاہتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ انگریزوں کی کچھ خطا نہ تھی۔ اور فسادیند لوگوں نے جھوٹی افواہیں مشہور کی تھیں۔ لیکن چونکہ ہماری نیت نیک تھی۔ اور ہم نے محض اپنے مذہب کی محبت میں یہ کام کئے تھے۔ اسواسطے خدا ہم کو جزائے خیر دے گا۔ اور ہم شہیدوں کی موت مرینگے۔ اور گناہ انکی گردن پر ہو گا۔ جنھوں نے جھوٹی خبریں مشہور کر کے یہ غدر کرایا۔

یوسف نے کہا۔ آپ تو کاغذ دیکھکر فرماتے تھے کہ اس میں انگریزوں کا فریب ہے اب آپ ان کو بے گناہ کہتے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا اُس وقت میرا یہی خیال تھا۔ مگر میرٹھ جا کر جب کاغذات اور حالات پر غور کیا گیا۔ تو میں نے فوجی افسروں سے کہدیا تھا کہ انگریزوں کی بدنیتی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن وہ نہ مانے اور فساد کر ہی دیا۔

صبح کو یہ سب لوگ پھانسی گھر کے سامنے لائے گئے۔ پہلے مولوی صاحب کو لٹکایا گیا۔ اور انھوں نے آواز دیکر کہا کہ خبردار کوئی شخص ہمت نہ ہارے ہم سب غلط فہمی کا شکار رہے۔ خدا ہم کو معاف کریگا۔ اور ان کو سزا دیگا۔ جنھوں نے انگریزوں کی عورتوں اور بچوں پر ظلم کئے۔ مولوی صاحب کے بعد یوسف اور اسکے چچا کو بھی پھانسی ہوگئی۔

چودھواں فسانہ
شہزادے کی جاروب کشی

آج اور کل کے فرق کو سمجھنے میں یورپین اور ایشیائی فلاسفروں کے اقوال پر غور کرنے سے بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ مگر اس کو صرف دماغ سمجھ سکتا ہے آنکھ کو شاہدہ کا لطف نہیں آتا۔

۴ اگست ۱۹۱۴ء سے جرمنی قوم کا آج پیش نظر تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسکا کل کیا ہوگا۔ مگر ۱۹۱۸ء نے بتا دیا۔ دکھا دیا۔ اور سمجھا دیا کہ کل کی یہ حالت ہے اور ایسا دکھایا کہ اب فلسفہ کی ضرورت ہی نہ رہی۔

روس کا آج صدیوں سے مشہور تھا۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اسکی آمد ہندوستان کا چرچہ سنتا تھا۔ اور ایک خوفناک وحشی اور موذی حریت کی چڑھائی کو آفت امن خیال کرتا تھا۔ لیکن آج ختم ہوا اور کل ایسا دیکھنے میں آیا کہ روس کا تاج وتخت ہی اندھا ہو گیا۔ دہلی میں مغلیہ خاندان کا غلغلہ اس کی تیغ زنی اور بزم آرائی کے دوگونا گوں صفات کے سبب گھر گھر شور مچا ہوا تھا۔ اور ہندوستان کا کوئی خطہ انکی عظمت سے انکار کرنے کی مجال نہ رکھتا تھا۔ مگر جب ان کا آج ختم ہوا تو کل کی حالت

کسی سے نہ دیکھی گئی۔

ایک دہلوی نے گریٹ مغل اعظم کی تباہی کے افسانے خود انہی سے سن سنکر قلمبند کیئے جن پر یہ افتاد پڑی تھی۔ تو ہندوستان نے لکھنے والے کے ان مضامین کو ماسٹر پیس کا خطاب دیا۔ اور اسکی انشا پردازی کو ان افسانوں کے باعث ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی۔ دہلوی محرر نے خیال کیا۔ میری انشا کے کمال کو دیکھا جاتا ہے واقعات پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ اور کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ ان سچے قصوں سے اپنی زندگی کے آج اور کل کو سمجھے اور نتائج نکالکر عبرت حاصل کرے۔

جو قوم پستی میں گرتی ہے وہ مقصود کے ذرائع کو مقصود بنالیتی ہے۔ یہی حال ہندوستان کا ہے کہ اس نے تحریر کی داد دی۔ اسپر واہ واہ کی اور واقعات اصلی کی گہرائی پر کسی کی نظر نہ گئی اور گئی تو اسکی تاثیر کو ظاہر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

سنہ ۱۹۱۷ء میں اپنے پیارے عزیز ملا محمد واحدی ایڈیٹر اخبار خطیب ورسالہ نظام المشائخ کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ میز پر سر جھکائے کام کر رہے تھے۔ ان کا عملہ بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھا۔ اور میں ایک جاروب کش کو دیکھ رہا تھا جو آہستہ آہستہ سے صحن کو صاف کرتا تھا۔ اور چمن کے پھولوں کو دیکھتا جاتا تھا۔ جب وہ کمرہ کا صحن صاف کر چکا تو نل سے پانی لیکر پھولوں میں ڈالنے لگا۔ پانی ڈالنے میں اس کے ہاتھ پھولوں کے ساتھ ایسی محبت کا اظہار کرتے تھے کہ اس کو میرے دل نے گل پرستا خیال کرنا شروع کر دیا۔ جاروب کش نے ہر گملہ کا کوڑا صاف کیا۔ مرجھائے ہوئے پتے توڑ کر پھینک دیئے۔ اور گملوں کو قرینے سے درست کرنے لگا۔ اتنے میں واحدی صاحب نے آواز دی۔ محمود! جاروب کش "حاضر ہوا جناب" کہکر دوڑا اور ہاتھ باندھکر سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور ایک تازہ خدمت کا حکم سنکر تعمیل کو باہر چلا گیا۔ اس کی پھرتی شائستگی اس کا قرینہ ادب مجکو بہت اچھا معلوم ہوا۔ اور میں نے خیال کیا کہ ایسا تمیز دار

نوکر بہت کم دیکھنے میں آیا ہوگا۔ واحدی صاحب سے محمود جاروب کش کا حال پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تیموری شہزادہ ہے۔ اور شہنشاہ دہلی سے بہت قریبی واسطہ رکھتا ہے۔ مجکو اس اطلاع نے حیرت کا طلاطم میں ڈالا۔ وہ روس کے اس باشندہ کی بیقراری سے زیادہ تھا جبکہ اُس نے اپنے تاجدار کے قتل کی خبر سُنی ہوگی۔ کیونکہ وہ ایک موت کی خبر تھی۔ جو ختم ہوگئی اور یہ ایک زندگی کی اطلاع تھی۔ جس کے ختم ہونے کی میں امید نہیں کرسکتا تھا۔ اس دن کے بعد میں جاروب کش محمود کو اُس کے قدیمی لقب "صاحب عالم" سے یاد کرتا تھا۔ کیونکہ مغلیہ تخت کی بحالی کے ایام میں سب شہزادوں کو صاحب عالم کہا جاتا تھا۔ یہانتک کہ آخری ایام میں انگریز افسر بھی ادنے سے ادنے متوسل نسل شاہی کو صاحب عالم کے بلند خطاب سے مخاطب کرتے تھے۔ میرزا محمود ایک نوجوان آدمی ہے اب بھی دفتر اخبار خطیب کے قریب اسکا مکان ہے جھوٹے جھوٹے بچے بال بچہ ہے۔ جو شاید اب تک اپنے فخر کو بھولے نہیں ہونگے۔ کیونکہ پیٹ کی مجبوری سے جب اپنے باپ کو خدمتگاری کرتے دیکھتے ہیں تو شرماتے ہیں۔ فاتح قوم کے بچوں کو کام کرنے اور مشقت سے روزی پیدا کرنے میں کبھی عار کا خیال نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ ان کو امید ہو کہ وہ اس تکلیف کے بعد پھر ایک عروج اور کامیابی کے زمانہ میں جانے والے ہیں۔ ورنہ زندگی ان کو دوزخ نظر آنے لگتی ہے۔ تیمور۔ بابر۔ ہمایوں نے اپنے پوتے میرزا محمود سے زیادہ زمانہ کی جفا اور دنیا کے خطروں کا تماشا دیکھا تھا۔ مگر آخر میں سب ختم ہو گئے۔ میرزا محمود قیامت تک یہ توقع نہیں کرسکتا کہ اس کی گردش کے دن بھی کبھی پھرینگے۔ اور وہ ذلیل خدمتگاری سے نجات حاصل کریگا۔ میرزا محمود کو شاید آج اور کل کے فرق سمجھنے کا کبھی خیال نہ آتا ہوگا۔ ورنہ وہ ایک ہی دن میں کامل ولی بنجاتا۔ اور خدمت لینے والے اسکے گھر پر سر جھکاتے ہوئے آتے۔ اسی دن جبکہ مجکو میرزا محمود کی حالت کا علم ہوا۔ واحدی صاحب نے بیان کیا کہ اِن کے چھاپہ خانہ میں ایک مزدور جو کل چلانے کا کام کرتا ہے حضرت مولانا

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا پوتا (یا نواسا ہے) دل میں سیاسی زخم کے برابر ایک مذہبی زخم بھی لگا۔ کیا خدا کی شان ہے کہ وہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی جنکی شاگردی اور علمی خوشہ چینی کا آج تمام ہندوستان اقرار کرتا ہے ان کے پوتے یا نواسے کی یہ حالت ہو کہ وہ چار آنے کی مزدوری کرکے پیٹ پالتا ہے۔ اس سے موجودہ ہندوستان کے بڑے آدمی آج اور کل کا نتیجہ نکال سکتے ہیں اور ان کو اپنے عروج و اقتدار کی ناپائداری کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اسپین کے قصر الحمرا اور اس کے بسنے والوں کی بربادی تاریخوں میں پڑھکر دل کی عبرت آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے۔ مگر لال قلعہ دہلی کے رہنے والوں اور ہندوستان پر خود مختار حکومت کرنے والوں کی تباہی پر کوئی ایک آنسو بھی نہیں بہاتا۔ محمود جارو کش کا قدیمی مکان دفتر خطیب سے سو قدم کے فاصلہ پر لال قلعہ میں تھا۔ جواہرات جڑے ہوئے پاخانے غسل خانے تھے۔ جہاں تاج و تخت کی دھوم تھی۔ جہاں لونڈی غلام کمریں باندھے ہوئے دوڑتے پھرتے تھے۔ یہ وہی شہزادہ محمود ہے جسکو ابھی ایک چھاپہ خانہ میں جھاڑو دیتا دیکھا گیا تھا۔ جو "حاضر جناب" کہکر اپنے آقا کے سامنے دوڑا ہوا آیا تھا۔ اور جو دست بستہ انتظار حکم میں خاموش کھڑا ہو گیا تھا۔ جس کے بڑے بڑے اعظم ہندوستان کی بلا شرکت غیر حکمراں تھے۔ جن کے سامنے بڑے بڑے نواب راجہ ہاتھ باندھکر کھڑے ہوتے تھے اور اپنے بادشاہ کے بلاوے پر "حاضر حضور" کہکر بے تحاشا دوڑتے تھے۔ شہزادہ محمود کو یاد نہ ہوگا۔ تاریخ کو سب کچھ یاد ہے۔ شہزادہ محمود کے دل کو قدرت نے صبر دیدیا۔ مگر مورخ کیونکر صبر کرسکتے ہیں اور کس طرح اس عجیب انقلاب کو دل سے فراموش کرسکتے ہیں۔ شہزادہ محمود آج ایک ایسے مکان میں رہتا ہے جہاں اس کے بڑوں کا ایک کمین سے کمین غلام بھی رہنا پسند نہ کرتا۔ نہ پکی دیوار ہے نہ پکی چھت ہے۔ نہ پکا صحن ہے۔ کچی مٹی کی دیواریں ہیں۔ جن میں کوئلہ اور ٹھیکریوں کی پچیکاری ہے اور جن پر بارش کی بوندیوں نے خاک کے ذروں کو چیر چیر کر گلکاریاں بنائی ہیں شہزادہ

محمود کو آج وہ کھانا ملتا ہے جو اس کے بزرگوں کے خدمتگاروں نے بھی کبھی نہیں کھایا تھا۔ وہ سوکھی روٹیاں چٹنی سے کھالیتا ہے۔ وہ اُبالی دال سے پیٹ بھر لیتا ہے۔ اور یہ بھی میسر نہ آئے تو اپنے معصوم بچوں کو تسلی دیتا ہوا فاقہ میں پڑکر سو جاتا ہے۔ شہزادہ محمود کے پاس نہ کمخواب کے کپڑے ہیں نہ زربفت کے۔ وہ اور اس کے بچے پیوند لگے کپڑے پہنتے ہیں۔ اور سردی آجائے تو پھٹی ہوئی گدڑیوں اور بوسیدہ کمبلوں کو اوڑھ کر رات بسر کرتے ہیں۔ آج جبکہ دسمبر ۱۹۱۸ء کا مہینہ ہے۔ دہلی میں نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے جلسے ہو رہے ہیں۔ اور بیرونی مہمان گرم کمروں میں قیمتی لحاف اور قیمتی کمبل اوڑھے پڑے سوتے ہیں۔ آج گورنمنٹ ہاؤس میں ہندوستان کے حکمران آگ کی انگیٹھیوں کے آس کرسیوں پر لیٹے باتیں کر رہے ہیں۔ ٹھیک آج ہی کے دن شہزادہ محمود اور اسکی طرح سینکڑوں شہزادے ٹوٹے پھوٹے مکان میں گیلی اور ٹھنڈی خاک پر بوریا بچھائے اور پھٹی ہوئی رضائیاں اُوڑھے بھوکے پیاسے پڑے ایڑیاں رگڑتے ہیں۔ اس کو کچھ بہت دن نہیں ہوئے۔ صرف ساٹھ برس کا زمانہ گزرا ہے کہ اسی دہلی میں لال قلعہ آباد تھا۔ اور اس میں شہزادہ محمود کے بزرگ شال دوشالے اُوڑھے سونے چاندی کی سہریوں میں پاؤں پھیلائے بے غل وغش پڑے سوتے تھے۔ اور ان کو یہ کیفیت خواب میں بھی نظر نہ آتی تھی۔ کہ ان کی اولاد ایک دن محتاجوں اور بیکسوں کی زندگی بسر کریگی۔ اگر انکے خواب میں یہ حالت کبھی آجاتی تو وہ ضرور ایک نوشتہ موجودہ دہلی کے عیش پرستوں کو لکھ جاتے کہ وقت کی گردش کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ شہزادہ محمود کے بچے اگر اپنے بڑوں کا پہلا وقت یاد کر کے کہیں کہ ہمکو بھی دوشالے منگوا دو ہمکو بھی سنہری روپہلی سہریاں بنوا دو ہم بھی سونے چاندی کے برتنوں میں پلاؤ قورمے کھائیں گے ہمکو بھی ہندوستان کے راجہ نواب صاحب عالم پناہ کہکر اور جھک جھک کر سلام کریں۔ تو بچارا محمود سوائے اس کے کہ آنکھوں میں آنسو لے آئے اور آسمان کو دیکھکر کلیجہ مسوس لے اور کیا خاک جواب دیگا

دہلی والوں کو معلوم ہے کہ لال قلعہ کے شہزادے بڑے موسم پرست تھے۔ سردی۔ گرمی اور خصوصاً برسات کے موسموں سے خوب لطف اُٹھاتے تھے۔ ہر موسم کی ترکاریاں۔ ہر موسم کے کپڑے۔ ہر موسم کے کھانے۔ دریادلی سے غریبوں۔ محتاجوں کو بانٹنے اور کھلا کر کھانے کا انکا معمول تھا۔ مگر آج شہزادہ محمود کے بچے نہ سردی کی کوئی اچھی چیز کھا سکتے ہیں۔ نہ گرمی کی نہ برسات کی بہار ان کے گھر میں آتی ہے۔ نہ اور کوئی خوشی۔ ان کو پیٹ بھر کر روٹی اور تن ڈھکنے کو کپڑا ابھی پورا نصیب نہیں ہوتا۔ وہ بالکل بھول گئے کہ ہم شہزادے ہیں۔ انکو بالکل یاد نہیں کہ ہم اس دہلی اور ہندوستان کے بادشاہ تھے۔ آج تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک خدمتگار باپ کے بچے ہیں۔ جو دس روپیہ مہینے کا نوکر ہے جو صبح اندھیرے سے نوکری پہ جاتا ہے۔ اور رات کو اندھیرے میں واپس آتا ہے۔ ان بچوں کو اس کی خبر نہیں کہ انکے بڑے عید کے دربار کرتے تھے۔ اور لاکھوں روپیہ اور شال دوشالے غریبوں کو تقسیم کرتے تھے۔ وہ تو یہ جانتے ہیں کہ کسی عید میں انکو نئی جوتی نصیب نہیں ہوتی۔ اور نہ کوئی نیا کپڑا ملتا ہے۔ کیونکہ ان کا باپ کہتا ہے کہ بیٹا اب کے جوتی اور کپڑا مہنگا ہے۔ میاں نے تنخواہ جو دی تھی وہ آٹے والے کے پاس چلی گئی اور پھر بھی اسکا قرضہ باقی رہ گیا۔ خدا دیگا تو تمکو چوک کے بازار سے پُرانی جوتیاں خرید کر لادینگے اور وہ انکی پہننا اور پُرانی جوتیوں کے شوق میں انتظار کا زمانہ خوشی سے کاٹ دیتے ہیں جنکی بخار کے زمانہ میں جبکہ ان بچوں کا کماؤ باپ زمین پہ بخار میں پڑا ہوا ہائے ہائے کرتا تھا ان بھولے اور معصوم بچوں نے کئی کئی وقت فاقوں میں گزار دیئے اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دعائیں مانگیں کہ اللہ میاں ہمارے ابا جان کو اچھا کردو۔ چھوٹے بچے نے اگر روٹی کی ضد کی تو بڑی بہن نے اسکو کلیجہ سے لگالیا۔ اور کہا دیکھو ابا اچھے ہو جائیں تو آٹا لائینگے اماں روٹی پکائیں گی۔ ہم تم ملکر کھائیں گے۔ بچہ کہتا ابا کب اچھے ہونگے مجھے تو بہت بھوک لگی ہے۔ تو بہن کہتی گھبراؤ نہیں۔ اب اچھے ہو جائینگے اور بازار جائیں گے۔ بچہ مصیبت کی ماری

شہزادی یعنی اپنی ماں کے پاس جاتا اور کہتا۔ اماں جان روٹی دو۔ تو اسکو پیار کرتی اور کہتی۔ بیٹا روٹی کہاں سے لاؤں۔ خدا کمانے والے کو جان سے بچالے۔ ابھی تو اسی کے للّے پڑے ہوئے ہیں۔ میاں ہم غریب لوگ ہیں۔ نہ ہمارے پاس دوا ہے نہ روٹی ہے نہ کپڑا ہے خدا خوش رکھے حکیم اجمل خاں کو جنھوں نے دوائی کا اور کھانے کا بندوبست کیا۔ اور خدا خوش رکھے اس محلہ کے نیک آدمی محمد علی کارخانہ دار کو۔ تمہارے ابا کی اور سارے محلے کے بیماروں کی خبر گیری کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے کھانے کو بھی پوچھا تھا۔ مگر میں غیرت کے مارے نہ کہہ سکی کہ میرے یہاں کھانا نہیں ہے۔ ہم تیموری نسل کے لوگ ہیں۔ کیونکر بھیک مانگیں اور خیرات کی روٹی طلب کریں۔ یہی بہت ہے کہ خیرات کی دوا تمہارے ابا کے لئے لے لی۔ دیکھو بیٹا۔ تم ہندوستان کے بادشاہ کی اولاد ہو اور بادشاہ کی اولاد بھیک نہیں مانگا کرتی۔ اور نہ خیرات لیتی ہے۔ تم بڑے ہو کر کبھی بھیک نہ مانگنا۔ اور اپنے ابا کی طرح محنت مزدوری کر کے روٹی کمانا۔ بچہ نے رو کر کہا اچھا اماں میں کسی سے نہیں مانگونگا۔ مگر تم تو مجھے روٹی دو۔ اس وقت اس محتاج اور بے بس شہزادی نے آسمان کو دیکھا اور کہا اے مالک تو ہی سب کا رزاق ہے۔ تو ہی سب کا عیب پوش ہے۔ یہ معصوم بچے بھوک میں بلبلا رہے ہیں۔ میں کس سے اپنا دکھڑا کہوں۔ اور تیرے سوا اور کون سننے والا ہے۔ ہم پر رحم کر اور بیمار کو اچھا کر دے خدا کے فضل سے اب شہزادہ محمود تندرست ہو گیا اور کسی روزگار میں مصروف ہے جہاں اس کے مصارف کی ضرورتوں میں کمی نہیں پڑتی۔

مگر آج اور کل کے فرق سمجھنے کو اسکی اور اس کے اس خاندان کی حالت جو دہلی میں آباد ہے اور جس کی پریشانیاں اظہر من الشمس ہیں بہت کافی ہیں۔ اور بغیر کسی فلسفیانہ منطق کے انسان عروج وزوال۔ ذلت وعزت۔ بے نیازی ومحتاجی کا عینی تماشہ دیکھ سکتا ہے اور نتیجہ نکال لیتے ہیں اس کو کچھ مشکل پیش نہیں آتی۔

او جارو بکش شہزادے! تو اور تیری موجودہ زندگی. تیرے خاندان کا گذشتہ عروج کا تصور کرنے کے بعد دنیا کے حکمرانوں اور دولت کے دیوانوں کیلئے ایک تازیانہ عبرت ہو سکتی ہے اور فانی جاہ و منزلت کا غرور دماغ سے اسطرح نکلجاتا ہے جس طرح دھوپ سے سیل اور ترشی سے نشہ اور یہی اس سرگذشت کے لکھنے کا مقصد ہے۔

پندرھواں۱۵ فسانہ

غدر کی سیدانی ذکیہ بیابانی

یہ بالوں کے جلنے کی بُو کہاں سے آئی ہے، شاید پڑوس والے عامل صاحب کسی کے لئے کوئی عمل کر رہے ہیں. جب سے ان کے پڑوس میں مکان لیا ہے یہی آفت برپا رہتی ہے. کبھی گھی جلتا ہے۔ اور اس کی چکراہند سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ کبھی گوگل جلتا ہے اور گھر میں بٹھیا دوبھر ہو جاتا ہے۔

ذکیہ کی والدہ نقیہ نے کہا۔ ہاں بیٹی یہ عامل سفلی کا عمل جانتے ہیں اور اس میں اسی قسم کے خرافات ہوا کرتے ہیں۔ پرسوں سُنا تھا. نواب زینت محل بیگم صاحبہ نے اپنے کسی خاص رازدار کو اس عامل کے پاس بھیجا ہے. معلوم ہوتا ہے کہ کسی دشمن کے خلاف جادو کرانے کی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ یا اپنے شوہر حضرت سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی محبت زیادہ کرنے اور اپنی طرف ہی متوجہ رہنے کے لئے کوئی عمل کرایا ہوگا مگر بھلا

خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بال جلنے کی بو آتی ہے۔ اور بال عداوت اور بغض کے عملیات میں جلا کرتے ہیں۔

ذکیہ بولی نہیں بی۔ میں نے باواجان سے سُنا ہے کہ محبت بڑھانے یا پیدا کرنے کے اعمال میں بھی مطلوب کے بال جلایا کرتے ہیں۔

نعیمہ نے کہا جو کچھ بھی ہو۔ ہمارا تو اس پڑوس سے ناک میں دم ہے۔ تمہارے دادا نے خبر نہیں۔ ایسی جگہ مکان کیوں لیا ہے۔ جہاں رات دن اس قسم کے واہیات اور اور خلاف شریعت کام ہوتے ہیں۔ ذکیہ بولنے نہ پائی تھی کہ اس کے والد حضرت سید نورالہدا تشریف لے آئے۔ سفید ڈاڑھی سفید عمامہ۔ سفید چوغہ۔ سفید رنگت۔ ستر برس کا سن سال زہد و عبادت کے نور سے چہرہ پر ایک چمک اور جلال۔

ذکیہ نے اُٹھکر سلام کیا اور کہا۔ باواجان آپ کو کئی دن ہو گئے چلتے وقت آپ نے فرمایا تھا کہ صرف ایک دن کے لئے جاتا ہے۔ گڑگانوہ میں کسی صاحب سے ملکر کل تک واپس آجائیں گے۔

سید نورالہدیٰ صاحب نے جواب دیا ہاں بیٹی۔ مجھکو رُکنا پڑا۔ ان لوگوں نے دو دن تک نہ آنے دیا۔ کہو تم نے وہ چالیسوں حدیثیں یاد کرلیں۔ جو چلتے وقت میں نے تم کو بڑھائی تھیں۔

ذکیہ نے کہا۔ جی ہاں۔ میں نے انکو حفظ کرلیا۔ اور ترجمہ بھی یاد ہو گیا۔ مگر مجکو اس حدیث میں کچھ دریافت کرنا ہے دَعْ مَا یُرِیْبُکَ اِلیٰ مَالَا یُرِیْبُکَ (چھوڑ اسکو جو تجکو شبہ میں ڈالے اور اختیار کر اسکو جو بے شبہ ہو) اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آیا کہ جس چیز میں شبہ ہو اُس کو کیونکر چھوڑ سکتے ہیں۔ ہر معمولی آدمی کی طاقت سے بڑھکر ہے کہ وہ بے شبہ چیز اختیار کرے۔ کیونکہ آدمی کا دل ہر بات میں شبہ پیدا کرتا ہے۔ اور ایسی کوئی چیز نہیں معلوم ہوتی جو بالکل بے شبہ ثابت ہو جائے۔

سید نور الہدیٰ نے فرمایا۔ بیٹی یہ حدیث تین لاکھ حدیثوں سے چھانٹی گئی ہے اور اس میں ایک ایسا فلسفہ ہے جس کی ہر مسلمان کو ضرورت پڑتی ہے۔ دینی کاموں میں بھی اور دنیا کی باتوں میں بھی۔ ایک اور حدیث الاعمال بالنیات (سب کام نیت پر منحصر ہیں) بھی اسی قسم کی ہے جو ہمارے سب کاموں میں مدد دیتی ہے کیونکہ ہر عمل کی اچھائی اور برائی نیت سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک آدمی ظاہر میں اچھا کام کرتا ہے مگر نیت برائی کی رکھتا ہے۔ وہ کام اچھا نہ کہا جائیگا۔ اور خدا تعالےٰ اس کے نامۂ اعمال میں بدی لکھیگا۔ اور دیکھنے میں کوئی کام برا ہو اور نیت نیکی کی ہو تو وہ کام نیکیوں میں شمار ہوگا تم نے سنا نہیں۔ ایک آدمی نے مسجد کے سامنے کھونٹی گاڑی تھی کہ نمازی مسافر اس سے اپنے گھوڑے باندھکر نماز پڑھیں گے۔ مگر کسی نے اُس سے گھوڑا نہ باندھا اور رات کے وقت بیسوں آدمی اس کھونٹے سے ٹھوکریں کھاکر گرے اور انکے چوٹیں لگیں۔ مگر خدا نے کھونٹے گاڑنے والے کے اعمال میں ثواب لکھا۔ کیونکہ اس کی نیت اچھی تھی۔

اور ایک آدمی نے کھونٹی اس لئے گاڑی تھی کہ لوگوں کے ٹھوکریں لگیں اور نمازیوں کو تکلیف ہو۔ اور وہ نماز سے باز رہیں۔ مگر کسی کے ٹھوکر نہ لگی۔ بلکہ انھوں نے اُس کھونٹی سے گھوڑے باندھے اور اطمینان سے مسجد میں جاکر نماز پڑھی۔ اُس شخص کی چونکہ نیت خراب تھی۔ اس واسطے اسکے نامۂ اعمال میں گناہ لکھے گئے۔

پس ہر بات نیت پر منحصر ہے۔ اور اِس حدیث نے قیامت تک کے اچھے برے کاموں کا دو لفظوں میں فیصلہ کردیا ہے۔ یہی حال اِس حدیث کا ہے جس کو تم نے پوچھا کہ اس میں بھی مسلمانوں کو دینی اور دنیا کے اعمال کا ایک قرینہ بتایا گیا ہے کہ شک و شبہ کے کاموں سے بچو اور شک و شبہ سے پاک کاموں کو اختیار کرو۔

اِس میں کچھ شک نہیں ہے کہ کم علم اور کم عقل کے آدمی شک و شبہ اور بلا شک و شبہ باتوں کی آسانی سے تمیز نہیں کرسکتے۔ جیسا کہ تم نے سوال کیا ہے۔ مگر حدیث شریف

کا منشا مسلمانوں کو مشکل میں ڈالنے کا نہیں ہے۔ اس لئے تو اس حکیمانہ مقولہ سے مشکلوں کو آسان کر دیا ہے۔ الدین یسر (دین آسان ہے) تم نے پڑھا ہوگا۔ ہمارے دین اسلام میں کوئی بات دشواری اور مشکل کی نہیں ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان لوگ ڈگدا میں نہ ہیں بلکہ ایک صاف اور یقینی راستہ دین کے معاملات میں اختیار کریں۔ ڈگدا کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام کو کرتا ہے مگر اسکے دل میں دھکڑ پکڑ رہتی ہے کہ خبر نہیں یہ اچھا ہے یا بُرا۔ رسول خدا صلعم کا منشا یہ ہے کہ مسلمان دھکڑ پکڑ میں نہ رہے اور جس میں ذرا بھی ڈگدا ہو وہ کام نہ کرے۔

میں تم کو مثال دیکر سمجھاؤں۔ ایک آدمی کہتا ہے۔ خدا ہے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں ہے تیسرا کہتا ہے۔ خبر نہیں وہ ہے یا نہیں۔ مجھے اس میں کچھ شک ہے۔ اب تینوں میں دو آرام سے ہیں جو صاف اقرار کرتا ہے۔ اس کو بھی آرام ہے۔ جو صاف انکار کرتا ہے وہ بھی مطمئن ہے مشکل اس دھکڑ پکڑ والے کی ہے۔ جو کبھی خیال کرتا ہے خدا ہی اور کبھی سوچتا ہے نہیں ہے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملات میں جو بات قرآن اور رسول خدا صلعم کے خلاف اور عقل کے مخالف نظر آئے اور لوگ کہیں کہ یہ خلاف نہیں ہے اور اپنی دلیلوں کے زور سے تم کو شبہ میں ڈالیں تو تم شک میں نہ پڑو۔ اور قرآن و حدیث کے بلا شبہ طریقہ پر جمی رہو۔

یا دنیا کے کسی کام میں تمہاری عقل اور تمہارے سچے دوستوں اور خیر خواہوں کا مشورہ کچھ ادھر کہتا ہو۔ اور خلقت کچھ اور رائے دیتی ہو تو تم کو اپنی عقل اور دوستوں کے مشورہ پر عمل کرنا چاہیے کہ یہ بلا شبہ ہے اور خلقت کی رائے پر نہ چلو کہ اس میں شک و شبہ کا امکان ہے۔

ذکیہ نے کہا۔ یہی تو میرا سوال ہے کہ معمولی علم و عقل کا آدمی شک و غیر شک میں کیونکر فرق کر سکتا ہے۔

سید نور الہدیٰ نے جواب دیا۔ آگ کا کام جلا دینا ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ آگ جلاتی نہیں۔ تو کون اس کو قبول کریگا۔ اسی طرح خدا نے سب آدمیوں کو نفع نقصان کے سمجھنے کی عقل دی ہے۔

ایک آدمی کہتا ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ رسولخدا صلعم کا کلمہ پڑہتا ہوں۔ مگر میری شان خدا نے ایسی بنائی ہے کہ اگر مجکو اپنا بزرگ تم نہ مانو گے تو خدا و رسول پر تمہارا ایمان لانا بیکار ہوگا۔ کیونکہ میری اطاعت تم پر فرض ہے۔

اس دعویٰ میں یہ شک ہے کہ اسلام کا مطلب تو خدا کی یکتائی اور رسول خدا کی رسالت کا قبول کرنا ہے۔ اگر کوئی آدمی اس کو قبول کرے اور قرآن کو اپنا پیشوا بنالے تو پھر اس کو کیا ضرورت ہے کہ اپنے جیسے آدمی کو خدا و رسول کے برابر سمجھے اور اسکا زرخرید غلام بنجائے۔ کیونکہ خدا و رسول خدا اور قرآن و اہل قرآن کی اطاعت کافی ہے ایسے آدمی کی اطاعت ضروری نہیں جو یہ کہے کہ مجکو نہ مانو گے تو خدا رسول پر بھی تمہارا ایمان غلط ہوجائیگا

ذکیہ نے کہا تو کیا ہم اپنے ہدایت کرنے والے اور خدا کا راستہ بتانے والے لوگوں کی اطاعت نہ کریں۔

سید نور الہدیٰ نے جواب دیا نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ خدا نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو۔ رسول کی اطاعت کرو۔ اور اصحاب امر کی اطاعت کرو اصحاب امر سے مراد یہی لوگ ہیں۔ جو خدا و رسول کا راستہ ہمکو بتاتے ہیں۔ میں مخالفت تو ان اطاعت کی کرتا ہوں جو یہ کہکر حاصل کیجائے کہ مجھ بندہ کی اطاعت کرو۔ ورنہ خدا و رسولخدا پر تمہارا ایمان لانا بیکار ہوگا۔ اور تم مومن نہ بن سکوگے۔ اس قول میں شک ہے اسلیے اس کو ترک کر دینا چاہیئے۔ اور خدا رسول اور قرآن و اہل بیت کی اطاعت بلا شبہ ہے۔ لہذا اسکو اختیار کرلینا چاہیئے۔ ذکیہ بولی۔ تو اگر کوئی امام یا مذہبی پیشوا قرآن و حدیث پر عمل کرانے اور ہماری دنیاوی اصلاح کرنے کیلئے اطاعت کا طلبگار ہو تو وہ بھی بندے کی اطاعت ہوگی اور بندہ

کی اطاعت میں آپ نے شبہ فرمایا ہے۔

سید نورالہدیٰ نے جواب دیا۔ نہیں ایسے امام یا پیشوا کی اطاعت عین رسولؐ اور خدا کی اطاعت ہے جو قرآن کے بموجب حکم دیتا ہو۔ اور جو امام یا پیشوا یہ کہے کہ تم قرآن نہ پڑھو تم حدیث نہ پڑھو۔ تم علم دین حاصل نہ کرو کیونکہ تم کو اسکی سمجھ نہیں ہے صرف میری اطاعت کرو اور مجھی کو قرآن۔ رسولؐ اور امام کا قایم مقام جانو تو ایسا شخص اطاعت کے قابل نہیں ہے کیونکہ قرآن شریف کی سب سے پہلی آیت میں علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث شریف میں رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ علم حاصل کرنا عورت مرد پر فرض ہے پس جو شخص دوسروں کو علم حاصل کرنے اور قرآن وحدیث پڑھنے سے روکتا ہے اور صرف اپنی اطاعت پر زور دیتا ہے وہ بالکل چھوڑ دینے کے قابل ہے۔ کیونکہ اس میں شک و شبہ ہے۔ اور شک و شبہ کے راستہ کو رسولخدا نے ترک کر دینے کا حکم دیا ہے۔

ذکیہ نے کہا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آگئی۔ رسولخدا نے اس حدیث میں ہمارے بہت بڑے فائدے کی بات فرمائی ہے۔ خدا ہمکو عمل کی توفیق دے۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کا خواب

سید نورالہدیٰ نے دس مئی ۵۷ء کی صبح کو اپنی بیوی نفیسہ اور لڑکی ذکیہ سے رات کا اپنا ایک خواب بیان کیا۔ اور کہا کہ میں نے ایک ہولناک آگ آسمان سے برستی دیکھی ہے جس سے آدمی اور جانور جل جل کے مر رہے ہیں۔ میرے ذہن میں اسکی تعبیر یہ آتی ہے کہ ملک میں خوفناک فساد ہونے والا ہے۔

ذکیہ نے کہا۔ فساد کی تعبیر آپ نے کیوں کی قحط بیماری وغیرہ بلائیں بھی تو اس خواب سے مراد ہو سکتی ہیں۔

سید نورالہدیٰ نے فرمایا۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ تم نہیں جانتیں ہیں آجکی تاریخ

سے پورے سو برس تک کے حالات جانتا ہوں۔ خدا تعالےٰ نے اپنی رحمت سے ہمکو سو برس آئندہ تک کے واقعات بتا دیئے ہیں۔ میں اپنی شہادت۔ تمہاری مصیبت اور اے ذکیہ تیری دردناک پریشانیاں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ مگر اف نہیں کرسکتا کہ مشیت کا لکھا پورا ہو کر رہیگا۔

ذکیہ یہ سُنکر خوف زدہ ہو گئی۔ لیکن چونکہ تعلیم یافتہ تھی مطمئن ہو کر بولی جب آپکو سب کچھ دکھا دیا گیا ہے تو ہماری اور اپنی سلامتی کیلئے دعا کیوں نہیں کرتے۔

سید نور الہدیٰ نے فرمایا اس واسطے دعا نہیں کرسکتا کہ مجکو دکھا دیا اور بتلا دیا گیا کہ اوکا نوشتہ ان مٹ ہے۔ اعمال کی سزا کا ملنا لازمی ہے۔ اس میں کسی کو دم مارنے کی جگہ نہیں ہے اے ذکیہ میں امام ہشتم کی اولاد میں ہوں۔ میرا نسب آجتک بالکل درست اور صحیح ہے اور خدا کے فضل سے میرے اعمال بھی بُرے نہیں ہیں میری شہادت اعمال فراتی کی سزا نہیں بلکہ اجداد کی سنت ہے تو اور تیری ماں کو بھی یہی خیال رکھنا چاہیے اپنے بزرگوں کی طرح مصیبتوں میں صبر وسکون سے کام لینا گھبرانا نہ کہ ہمارا خون ایک دن اُمتِ رسول کی بہتری کے کام آنیوالا ہے۔

نامفہوم الفاظ

یہ کہکر سید صاحب نے ایک جذبہ کی سی حالت میں یہ فرمانا شروع کیا۔

"ایک برس میں خون دوسرے برس میں تاج کی بربادی۔ تیسرے سال ٹھوکریں چوتھے سال زوال، وبال۔ بھونچال، پھر جھولا۔ کوئی نیچے آئیگا۔ کوئی اوُپر جائیگا۔ اسکے بعد ساٹھ برس گزر گئے۔ تو خون۔ بے امنی۔ دریا زمین کو نگل گیا زمین سورج کو کھا گئی۔ لوہا اور تانبا بولنے لگا اور زبانیں گونگی ہو گئیں۔ دو بیبیاں کا فرد و تخت پر اور تخت چھپر کے اندر مٹی کے چراغ میں لال بدخشاں کی روشنی۔ ذکیہ کے بچے تا دنیا دکی سہرکشی مسلمان پہاڑ پر اور سب زمین پر"

سید صاحب یہ فرماتے فرماتے چپ ہو گئے۔ اور رونے لگے۔ ذکیہ اور لقیہ دونوں پر ایسی ہیبت چھائی کہ منہ سے کچھ نہ بول سکیں اور چپ چاپ یہ مجذوبانہ باتیں سنتی رہیں یہانتک کہ سید صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے۔

غدر

آخر ۱۸۵۷ء کا مشہور غدر شروع ہو گیا۔ میرٹھ کی فوج باغی ہو کر دہلی میں آئی اور وہ آفت مچائی کہ سب معاملات زیر و زبر ہو گئے۔ ذکیہ اور اس کے والد نہو خاں کی مسجد کے پاس ایک مکان میں جو دہلی کے معمولی مکانوں کا نمونہ تھا رہتے تھے غدر شروع ہوا تو سید نور الہدیٰ نے گھر سے نکلنا ترک کر دیا۔ یہانتک کہ انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر تسلط حاصل کر لیا۔ باغی بھاگ گئے بہادر شاہ قلعہ چھوڑ کر فرار ہوئے اور گرفتار کئے گئے۔

شہر کی لوٹ اور گرفتاریوں کے زمانہ میں بھی سید صاحب گھر سے نہ نکلے آخر ایک فوجی جمعیت ان کے گھر میں گھسی اور سید صاحب کو گرفتار کر لیا۔ اسباب لٹ گیا فوج کا افسر انگریز تھا۔ اس نے کہا کیا تم ہی نور الہدیٰ ہو۔ اور تم ہی نے افواج کے فلاں فلاں سردار کو خطوط لکھے تھے۔ کہ انگریزوں کا قتل عام لوح محفوظ پر میں نے لکھا دیکھا ہے۔

سید صاحب نے کہا ہاں میں وہی نور الہدیٰ ہوں۔ افسر نے تعجب کے لہجہ میں کہا تم اپنے جرم کا اقرار کرتے ہو۔ سید صاحب نے کہا اپنی تحریر کا مجھکو اقرار ہے جرم کا اقرار نہیں ہے۔ انگریز بولا۔ کیا تم اس کو جرم نہیں سمجھتے کہ جاہلوں کو ایک گھوٹی بات لکھ کر قتل عام پر راغب کیا۔ سید صاحب نے اس کا جواب کچھ نہ دیا۔ اور آسمان کو دیکھکر ہنسنے لگے۔ ان کو ہنستا دیکھکر انگریز افسر کو غصہ آیا۔ اور اس نے ایک سنگین

ان کے ہونٹوں پر ماری جس سے ان کا جبڑا کٹ گیا۔ اور خون ڈاڑھی پر بہنے لگا۔ ذکیہ یہ دیکھکر چیخی۔ ہائے میرے ابو یا۔ سید صاحب نے زخم کھاکر بھی گھبراہٹ ظاہر نہ کی اور پھر آسمان کو دیکھا۔ اور خون اپنے چہرہ اور سینہ پر ملنے لگے یہ دیکھکر افسر نے اشارہ کیا اور ایک سپاہی نے تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ سید صاحب دو ٹکڑے ہوکر گر پڑے۔

اس کے بعد فوج باہر چلی گئی۔ اور عورتوں سے کچھ تعرض نہ کیا۔ ذکیہ اور نقیہ نے یہ عالم دیکھکر پہلے تو بہت نوحہ و بکا کیا اس کے بعد شہید کی میت دفن کرانے کا سامان کرنے لگیں۔ مگر دہلی میں اس وقت کوئی نہ تھا جو ان کی مدد کو آتا۔ آخر انھوں نے خود ہی لاش کو اپنی خون بھرے کپڑوں میں مکان کے صحن کو کھود کر دفن کر دیا۔

گھر کا سب مال لٹ گیا تھا لیکن آٹا دال لکڑیاں موجود تھیں۔ انہوں نے چند روز ان سے بسر اوقات کی اور جب یہ ختم ہوگئیں تو کھانے کا فکر ہوا۔

اس وقت شہر میں امی جی (امن) کا اعلان ہوچکا تھا اور بھاگے ہوئے آدمی آآکر آباد ہو رہے تھے۔ ذکیہ نے اپنی والدہ سے صلاح لیکر حاکم دہلی کے نام ایک خط لکھنے کی ٹھہرائی۔ تاکہ اس سے کچھ امداد حاصل ہو۔ نقیہ نے کہا خط تو لکھ لو گی۔ مگر اس کو پہنچائیگا کون۔ ذکیہ نے کہا پڑوس میں جو عاقل صاحب رہتے ہیں۔ سنا ہے وہ غدر میں نہیں بھاگے۔ اور سرکار کے بڑے خیر خواہ ہیں۔ تم ان کے پاس جاکر یہ خط کسی طرح پہنچوا دو۔ نقیہ نے اس تجویز کو پسند کیا اور خط لیکر عاقل کے پاس گئی عاقل ایک نوجوان آدمی تھا۔ اور گھر کی حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ عاقل بہت خوش حال ہے۔

نقیہ نے برقع کے اندر سے عاقل کو اپنی کیفیت سنائی۔ عاقل نے بہت ہمدردی ظاہر کرکے کہا حاکم دہلی سے مدد کی امید نہ رکھو۔ سید صاحب کا نام بڑے باغیوں میں درج ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ انھوں نے فوج کو بھڑکانے میں بہت زیادہ حصہ لیا تھا

اگر تم قبول کرو تو میں خود کچھ حاضر کردیا کرونگا۔ نقیہ نے کہا ہم خیرات کسی سے نہیں لے سکتے
تمہارا کچھ کام ہو تو اس کے عوض جو دوگے لے لیں گے۔ عامل نے کہا۔ ہاں اپنی
لڑکی سے کہو۔ کہ وہ میری کتابوں کی ایک فہرست بنادے۔ اور پراگندہ اوراق
کو ایک جگہ کردے۔ اس کے عوض میں تم کو دونوں وقت پکا پکایا کھانا اور
اوپر کا سب خرچ دیا کرونگا۔

نقیہ نے گھر آکر ذکیہ سے یہ حال کہا۔ اور اس نے اس نوکری کو قبول کرلیا
عامل نے ایک کمرہ بتادیا۔ جہاں کتابیں تھیں اور ذکیہ و نقیہ صبح سے شام تک
وہاں کام کرنے لگیں۔

ردّی میں ایک خط

ذکیہ کاغذوں کو درست کررہی تھی کہ اس کو ایک خط ردی کاغذوں میں ملا
ہوا دستیاب ہوا جس کا مضمون یہ تھا۔

"عامل صاحب تعویذ پہنچ گیا۔ ہم ہدایت کے موافق کام کرنے کو تیار ہیں۔
دھوبی پنجاب سے آگئی ہے۔ سید نورالہدیٰ صاحب بزرگ کے بارے میں
جو کچھ آپ نے لکھا ہے معلوم ہوا۔ ہم عنقریب ان کی زیارت کو آئینگے۔ اور
ان کی کرامات کے موافق ان کو نذر دیں گے۔ ہمکو اوپری تکلیف بہت ہے
کیا آپ اسکے اتار کی کوئی ترکیب بتاسکتے ہیں۔ پہلے آپ نے کشمیر کے عامل
کا پتہ بتایا تھا۔ اب ہم سب کی صلاح کشمیر کی ہوگئی ہے راقم آپ کا معتقد

(ن۔ن)

ذکیہ اس خط کو پڑھکر حیران رہ گئی اور اس نے بہت غور کے بعد سمجھا کہ یہ خط جنرل
نکلسن کا ہے جو حملہ دہلی کے وقت پہاڑی پر تھا۔ تعویذ سے مراد خفیہ اطلاع ہے جو عامل نے

بھیجی ہو گی۔ پنجاب کی دھونی سے مطلب فوج و توپخانہ ہے۔ جو تعویذ کی رعایت سے ایک اصطلاح بنائی گئی ہے۔ اوپری تکلیف کا مطلب پہاڑی کے مورچوں کی تکلیف ہے اور اُتار کا مقصد یہ ہے کہ دہلی میں داخل ہونے کی ترکیب بتایئے۔ کشمیر کے عامل سے مراد کشمیری دروازہ ہے جہاں سے فتح دہلی کے وقت حملہ ہوا۔ اور سید نور الہدیٰ کی نذر ان کا قتل ہے۔ ذکیہ سمجھ گئی۔ کہ ن۔ ن سے مراد جنرل نکلسن ہے۔ اور میرے باپ کی مخبری اسی عامل نے کی تھی۔ یہ خیال کر کے ذکیہ کی آنکھوں میں زمین و آسمان تاریک ہو گئے اور اس نے عامل سے اپنے باپ کا بدلہ لینے کی دل میں ٹھان لی۔

چنانچہ دوسرے دن رات کو وہ چھری لیکر عامل کے مکان میں گئی۔ تاکہ سوتے میں اس کا کام تمام کر دے۔ مگر اس نے جاکر دیکھا کہ عامل خوابگاہ میں نہیں ہے تو وہ مایوس ہو کر گھر واپس آگئی۔ یہاں آکر اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کی لاش خون میں غلطاں پڑی ہے اور سرہانے ایک خط رکھا ہے جس پر لکھا ہے۔

"ذکیہ تیرے ارادے کا بدلہ۔ اور اپنے رقیب کا انجام۔ تیری ماں ڈالی گئی کہ وہ مجکو تجھ تک پہنچنے میں سدراہ تھی۔ آج تو نے میرے مارنے کا ارادہ کیا تو میں نے اس کو قتل کر دیا۔ اب خط پڑھ چکی کہ تو دہلی سے باہر جانے والی ہے"

آخری فقرہ کو پڑھکر ذکیہ ماں کا صدمہ بھول گئی۔ اور چاہتی تھی کہ غل مچائے اور محلہ والوں کو مدد کے لئے پکارے کہ کسی نے دوڑ کر اس کا منہ بند کر لیا۔

انبالہ

ذکیہ کا منہ بند کیا گیا۔ آنکھیں بند کی گئیں یہانتک کہ تھوڑی دیر میں اس کے حواس بھی بند ہو گئے اور اس کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ اور ہوش آیا تو دیکھا کہ وہ ایک

اجنبی مکان میں ہے۔ اور عامل سامنے بیٹھا ہے۔ اور کہتا ہے تم انبالہ میں ہو۔ میں انگریزوں کی پناہ میں آگیا ہوں۔ اب تم کو باپ کا بدلہ لینے کی ہوس نہیں ہے۔ ذکیہ نے کہا میں سید ہوں شرم کرو اور نامحرم ہو کر سامنے نہ آؤ۔ عامل نے کہا۔ ابھی نکاح ہو جائیگا اور محرم بن جاؤں گا۔ ذکیہ نے اپنے منہ کو ہاتھوں سے چھپا لیا اور اپنے انجام و بے بسی پر غور کرنے لگی۔

خون

ذکیہ نے چہرہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا۔ کہ یکایک اسکو ایک زبردست آہٹ کی آواز آئی۔ اور کسی نے گالی دیکر عامل کے سر پر کچھ مارا۔ ذکیہ نے منہ کھول دیا اور دیکھا عامل کے نوکر نے لٹھ مار کر عامل کو قتل کر دیا ہے۔ اور ذکیہ سے کہتا ہے۔ جلدی بھاگو۔ میں تمکو بچانے آیا ہوں۔ ذکیہ اس کے ساتھ اُٹھ کر بھاگی۔ باہر ایک رتھ کھڑا تھا۔ اس میں سوار ہو کر قاتل نوکر کے ساتھ چلی گئی۔

کرنال

نوکر ذکیہ کو لیکر کرنال آیا جہاں اسکا گھر تھا۔ اور ذکیہ کو اپنی ماں کے پاس اُتار دیا۔ اور بولا یہ بی بی تم سیدانی ہو۔ اس ظالم عامل کی نوکری میں میں نے یہ سُنا اور اس کے بُرے ارادے کو معلوم کر کے مار ڈالا تا ثواب جاتا۔ اب دعا کرو کہ گرفتار نہوں۔ یہ باتیں کر رہی رہا تھا کہ باہر پولیس نے اس کو آواز دی۔ نوکر نے کہا لو قضا آ گئی اماں خدا حافظ۔ اس عورت کی خبر رکھنا میں بھاگتا ہوں۔ جی بچا تو کبھی آ جاؤنگا ورنہ یہ آخری سلام ہے۔ یہ کہکر دوسرے دروازہ سے نکلکر باہر چلا گیا۔ پولیس تین آوازیں دیکر اندر داخل ہو گئی۔ اور جب اس نے دوسرے دروازہ کا حال معلوم کیا تو قدموں کے نشان پر

باہر چلی گئی۔ مگر ہر چند تلاش کیا قاتل نوکر کا سُراغ پولیس کو نہ چلا۔

آخر سرکار نے نوکر کے گھر کی ضبطی کا حکم صادر کیا اور سارا سامان نیلام ہو گیا نوکر کی ماں گھر سے نکلکر اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں چلی گئی۔ اور ذکیہ کو ساتھ لیتی گئی۔ مگر اس رشتہ دار نے ان کو اپنے ہاں ٹھیر لینے سے انکار کیا۔ اور کہا تم سرکاری مجرم سے تعلق رکھتی ہو۔ میں اپنے ہاں تم کو نہیں ٹھہرا سکتا۔ نوکر کی ماں نے اپنے سب رشتہ دارں اور بیٹے کے دوستوں کے گھر دیکھ لئے۔ مگر کسی نے ان کو پناہ نہ دی۔ تو مجبور ہو کر بڑھیا نے ذکیہ سے کہا۔ اب چلو مسجد میں چلو کہ وہ خدا کا گھر ہے۔ وہاں تو امن ملیگا۔ مگر جب یہ مسجد میں گئی تو ملّا نے کہا یہاں عورتوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ ذکیہ نے کہا۔

"ہم بیکس ہیں۔ ہم مظلوم ہیں۔ ہم بے وارث ہیں۔ ہمارے سب سہارے ٹوٹ گئے۔ اسواسطے خدا کے دروازہ پر آسرا ڈھونڈھنے آئے ہیں۔ ہمکو نہ نکال کہ ہمارا اب کہیں ٹھکانا نہیں ہے ہم کہاں جائیں کہ کوئی ہمکو اپنے گھر میں نہیں آنے دیتا خدا سے ڈر اور لاوارثوں کو دھکے نہ دے"

ملّا نے ہنسکر کہا۔ یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ سرائے نہیں ہے جس میں تم ٹھیرو۔ خیر اسی میں ہے کہ خود نکل جاؤ ورنہ چٹیا پکڑکر نکالدونگا۔ بڑھیا نے رو کر کہا۔ یہ سیدانی ہے اسکی بے حرمتی نہ کر۔ اور ایسے الفاظ منہ سے نہ نکال۔ ملّا نے کہا ایسی بہت سی سیدانیاں دیکھی ہیں۔ باتیں نہ بناؤ۔ اور یہاں سے جاؤ۔ یہ کہکر ملّا نے دونوں کو دھکے دیدیے جس کے صدمہ سے بچاری بڑھیا مسجد کے دروازہ کے باہر اوندھے منہ گر پڑی اسکے رہے سہے دو دانت بھی ٹوٹ گئے اور تھوڑی دیر کے لئے وہ بیہوش ہو گئی۔ ذکیہ نے بڑھیا کو سہارا دیکر اُٹھایا۔ اپنے ڈوپٹہ سے اُسکے منہ کا خون پونچھا۔ اور کہا اماں ہوشیار ہو گھبراؤ نہیں خدا ہماری مدد کریگا۔ بڑھیا نے بڑی ناتوان اور دھیمی آواز میں جواب

دیا۔ ہاں بیٹی۔ خدا ہی مددگار ہے میرے سینہ پر بہت چوٹ لگی ہے۔ میرا سانس رکا جاتا ہے میں بیمار تو مدت سے تھی اسپر بیٹے کی جدائی۔ گھر کی تباہی۔ اور اس دربدری کی برائی کا صدمہ ملانے اس زور سے دھکا دیا ہے اور میں ایسی گری ہوں کہ اب زندگی کی امید نہیں معلوم ہوتی ہے۔ میرے دل پر چوٹ لگی۔ یہ کہتے کہتے بڑھیا کو ابکائی آئی۔ اور اسنے خون کی قے کی جس سے معلوم ہوا کہ اسکے پھیپھڑے پر شدید ضرب آئی ہے۔ خون کی قے کرتے ہی بڑھیا کا ہوش گم ہونے لگا۔ اور ذکیہ بھی گھبرا گئی۔

بڑھیا نے کہا:۔ اے ملا تو نے میری جان ناحق لی۔ میں اس بے وارث سیدانی کو لیکر آئی تھی۔ میں مرتی ہوں اپنے رسولؐ کے پاس جاؤنگی بی بی فاطمہ کے قدموں میں سر جھکاؤں گی اور کہوں گی کہ تمہاری ایک بیٹی پر جوان بیٹے کو قربانی چڑھایا۔ اور خود بھی فدا ہو گئی۔ بی بی فاطمہ مجھکو گلے لگا لیں گی۔ رسول خدا حضرت علیؓ کے ہاتھ سے کوثر کا جام مجھکو دلوائینگے۔ آہ دم چلا۔

اور پھر ابکائی آئی۔ بڑھیا نے پھرتے کی اور جیتا جیتا لال لال خون آئیں آیا اس نے بڑھیا کا کام تمام کر دیا۔ اور ایک ہی ہچکی لیکر اس نے جان دیدی۔

اس وقت عجیب منظر تھا۔ ذکیہ لاش کو سنبھالے مسجد کے دروازہ کے آگے شارع عام پر بیٹھی تھی۔ اور کسی پرسان حال کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈھونڈتی تھی۔ مگر اسوقت کوئی راہ گیر بھی نہ آیا تھا۔ جو ان بیکسوں کی بات پوچھتا۔ ملانے مسجد کا دروازہ بند کرلیا تھا۔

آخر ذکیہ نے مایوس ہو کر آسمان کو دیکھا اور کہا۔ اے خدا میں تیرے پیارے رسول کا خون ہوں۔ میری سُن۔ اور مجھکو اس امتحان میں نہ ڈال۔

یکایک ایک فقیر ادہر سے گذرا۔ اور اس نے جو یہ حالت دیکھی تو محلہ والوں کے پاس جاکر خبر دی۔ ادا نہوں نے جمع ہو کر ذکیہ کا حال پوچھا۔ ذکیہ نے ملاکی شکایت کی اور محلہ والوں سے بڑھیا کی تجہیز و تکفین کا سامان کرنے کو کہا چنانچہ تھوڑی دیر میں بندوبست

ہو گیا۔ اور ذکیہ بھی میت کے ساتھ قبرستان تک گئی۔ دفن سے فارغ ہو کر اُس نے دیکھا کہ جو فقیر مسجد کے سامنے ملا تھا اس کی جھونپڑی اسی قبرستان میں ہے۔ فقیر بہت بڈھا آدمی تھا۔ ذکیہ اس کے پاس گئی۔ اور کہا باوا مجھے بھی تھوڑی سی جگہ اپنے پاس دو۔ فقیر نے کہا بیٹی تیرا گھر ہے شوق سے رہ۔

یہ فقیر روزانہ بھیک مانگنے جاتا تھا۔ اور روٹیاں ٹکڑے نقدی وغیرہ جمع کر کے لاتا تھا جن میں خود بھی کھاتا اور ذکیہ کو بھی کھلاتا۔

ذکیہ بھیک مانگتی ہے

چند روز کے بعد فقیر بیمار ہو گیا۔ تو اُس نے ذکیہ سے کہا بیٹی اب تو شہر میں جا اور بھیک مانگ کر لا۔ ذکیہ نے دل میں خیال کیا۔ میں سیدانی ہوں اور مجکو بھیک جائز نہیں ہے۔ مگر اس نے سوچا کہ جب بھیک کے ٹکڑے کھا چکی ہوں تو مانگنے میں کیا شرم مجبوری انسان سے سب کچھ کراتی ہے۔ چنانچہ برقع پہن جھولی ہاتھ میں لے شہر میں چلی گئی۔ جب وہ ایک محلہ میں گئی تو اُس نے یہ صدا لگائی۔

"یہ دنیا ناگ پھنی کا پھول ہے جو اس کو چاہے اُسکی بڑی بھول ہے
دو سانس کی زندگی پر کیوں اتراتا ہے یاد رکھ مرنیکا وقت سامنے
چلا آتا ہے۔ غفلت میں کیوں سوتا ہے اور وقت کی دولت کھوتا ہے۔
اُٹھ باندھ کمر چل منزل کو۔ اور دیکھ خدا کی محفل کو۔ روٹی کا نوالہ سالن
میں ڈوب کر گل جاتا ہے دل بھی طمع میں گر کر شل ہو جاتا ہے۔ آگ کا
شعلہ چولہے کے اندر ہی گاتا ہے۔ دیکھو خود پرست انگارا راکھ ہو جاتا ہے
رِزْقُكُمْ فِي السَّمَاءِ کی رحمت ہے اسی رحمت سے سوال ہے بندہ
کیا دیگا: دینے والا وہ ذوالجلال ہے۔"

ذکیہ کی اس صدا کی دھوم مچ گئی۔ محلہ کے پڑھے لکھے آدمی اس کے آس پاس جمع ہوگئے اور روٹیاں لا لاکر اس کی جھولی میں ڈالنے لگے۔ کسی نے کہا بی بی سامنے والے مکان میں جاؤ۔ وہاں آج محرم کی مجلس ہے۔ مجتہد صاحب حدیث خوانی کر چکیں گے تو فقرا کو کھانا تقسیم ہوگا ذکیہ مجلس میں چلی گئی۔ تو اس نے دیکھا ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ اور مجتہد صاحب آل محمد کے فضائل اور انکی خدمت اور محبت کی بڑائیاں بیان کر رہے ہیں آخر میں اُنھوں نے کہا" کاشکے ہم لوگ کربلا میں ہوتے اور اپنے جان و مال کو اہلبیت پر نثار کرتے۔ یا بعد کے اماموں کا زمانہ ہی ہکو ملتا۔ اور اُن کی مصیبتوں کے وقت ہماری جانیں قربان ہوتیں۔ ہم آل محمدؐ کے غلام ہیں۔ ہم آل محمدؐ کے فدائی ہیں۔ ہماری ساری زندگی ان کے قدموں کے نیچے بچھی ہوئی ہے۔ آج یہ تمام کروفر یہ سب دھوم دھام آل رسولؐ کی خاطر ہے آج تمام دنیا میں اسوقت تک لاکھوں مقام پر آل محمد کی یادگار میں مجلس ہو رہی ہوگی"

ذکیہ نے مجتہد صاحب کی یہ تقریر سُنی تو بلند آواز سے کہا سنئے سنئے مجھے کچھ کہنا ہے خلقت نے ذکیہ کو روکا۔ اور جھڑک کر کہا کہ بے ادبی نہ کر۔ اور چپکی رہ۔ قبلہ و کعبہ کے کلام کو پورا ہو جانے دے۔ مجتہد صاحب کے چہرہ پر بھی بل پڑ گیا اور اُنھوں نے فرمایا کیسی بے تمیز عورت ہے۔ ذکیہ نے کہا خفا نہو۔ اب تمہارا بیان ہو چکا اب اسکا بیان سُنو جس کی مدد و نصرت کے لئے ٹھنڈے سانس بھر رہے تھے۔ میں امام ہشتم کی نشانی ہوں اگرچہ زمانے کی ستائی ہوئی بھکارن بے گھری بے دری ذکیہ بیابانی ہوں۔ ذکیہ کی اس تقریر میں ایسا درد تھا کہ مجمع پر سناٹا چھا گیا اور مجتہد صاحب سمیت سب لوگ حیرت سے اسکی بات سُننے لگے۔ ذکیہ نے سب کو مخاطب بنا کر یہ تقریر کی۔

"مجتہد صاحب اور جلسہ والوں کو معلوم ہو کہ حسینؑ اور انکی اولاد اب بھی کربلا کی تکلیف میں مبتلا ہے حسینی باغ کے پھول آج بھی ستم کی دھوپ میں کملا رہے ہیں۔ اس دنیا کی ہر گلی میں بی بی فاطمہؓ کی اولاد خستہ حال ٹھوکریں کھاتی پھرتی

ہے۔ سیدوں پر آج بھی یزیدی مظالم ٹوٹ رہے ہیں۔ تم لوگ یونہی
جھوٹی آہیں بھرتے ہو۔ اگر تم کربلا کے وقت موجود ہوتے۔ تو اسیطرح
آل محمدؐ سے بے خبر رہتے جیسے آج ہو۔ اگر تم پاک اور معصوم اماموں
کا زمانہ پاتے تب بھی اسی طرح خود غرض نظر آتے۔ اور تم میں ایک
بھی ان کی مدد نہ کرتا۔

اے مجتہد صاحب تم۔ اور تمہاری طرح سب پیشوا لوگ ہمارا نام
لیکر روٹی کھاتے ہو۔ عزت پاتے ہو۔ محبانِ اہل بیت مومنین پر حکومت
کرتے ہو۔ مگر تم میں سے ایک کو بھی بنی فاطمہ کی پریشان حالی سے ہمدردی
نہیں ہے۔ اِن مجلسوں کی دھوم دھام سے تمہارا مقصد دنیا کی ناوری
ہے۔ آل محمدؐ کی خدمت نہیں ہے۔ یہ مٹھائیاں اور کھانے ہماری الفت
میں تقسیم نہیں کئے جاتے ان میں تو تمہاری دولت کی نمود ہے۔ اور
دکھاوے کے خیالات ہیں۔ ہمارے نام کی محبت اور ہمارے کام کی
فدائیت کے خیال سے مومنین تم کو گھر کی دولتیں بخش دیتے ہیں اور
تم اُن کو ذاتی عیش و آرام میں گنواتے ہو۔ عمدہ کپڑے عمدہ کھانے
عمدہ مکان۔ عمدہ سواریاں۔ عمدہ نوکر رکھتے ہو۔ اور آل محمدؐ کی
بھوک پیاس میں ایک پیسہ تمہاری جیب سے نہیں نکلتا۔ بتاؤ بتاؤ
آج کے دن جو لاکھوں مجلسیں ہو رہی ہیں۔ اور اُن میں کروروں روپیہ
خرچ ہو رہا ہے وہ آل محمدؐ زندہ اور موجود بنی فاطمہؑ کے حصہ میں
کتنا آتا ہے۔ کتنے سادات کی فاقہ کشی دور کرائی جاتی ہے۔ کتنے اہلبیت
کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں خرچ ہوتا ہے۔ کس قدر سیدوں اور
محتاج و بیکس سیدانیوں کی خبر گیری کیجاتی ہے۔ چپ کیوں ہو۔ بولو

جواب دو۔ کیا بول سکتے ہو۔ کیا جواب دے سکتے ہو۔ یا تمہارے دل نادم ہیں۔ اور میری کھری بات نے تم کو شرمندہ کر دیا ہے۔

مجتہد صاحب توبہ کرو۔ اور دنیا بھر کے مجتہدوں اور ان لوگوں کو پیام دو جو آل محمدؐ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور محبان آل محمدؐ کی سزا دیاں کر رہے ہیں کہ قیامت کے دن رسولِ خدا تم سے ان جھوٹے وعدوں کی نسبت جواب طلب کرینگے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ اور سیدہ مظلومہ بی بی فاطمہ دریافت فرمائینگے کہ تم نے ہماری اولاد کیساتھ عملی محبت بھی ظاہر کی یا محض زبانی باتیں بناتے رہے"۔

ذکیہ کی اس تقریر سے سب لوگ ششدر رہ گئے اور کسی کی جرات بولنے کی نہ ہوئی اسکے بعد ذکیہ چپکے سے نکلکر قبرستان میں چلی گئی۔

کچھ دن کے بعد ذکیہ نے ایک شریف مزاج سید سے نکاح کر لیا۔ وہ سید کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اور ذکیہ کے اصرار سے قبرستان ہی میں انہوں نے مکان بنا لیا جہاں ذکیہ ساری عمر رہی۔ ذکیہ جمعہ کے دن قبرستان میں مسلمانوں کے سامنے دنیا کے انجام پر وعظ کہا کرتی تھی اور ہزاروں آدمی اسکی نصیحت آمیز پر اثر تقریر سننے آتے تھے۔ اور سکا نام سب لوگوں میں ذکیہ بیا بانی مشہور ہو گیا تھا۔ جواب بھی کہیں کہیں اسی نام سے مشہور ہے۔

دو شہزادے جیلخانہ میں

میرزا تیغ جمال کی عمر اب اسی برس کی ہے غدر ۵۷ء میں وہ انیس بیس برس کے گبرو جوان تھے۔ اور ان کو غدر سے پہلے کی باتیں ایسی یاد ہیں جیسے ابھی کل کی گزری ہوئی حالت کو بیان کیا کرتے ہیں۔

تیغ جمال میرزا فخرو ولیعہد دوم کے لڑکے ہیں۔ میرزا دارا بخت بہادر شاہ کے پہلے ولیعہد تھے۔ لیکن جب ان کا انتقال ہو گیا تو میرزا فخرو ولیعہد قرار پائے۔

میرزا فخرو بہت دیندار اور متقی شہزادہ تھے۔ اگر دہلی کا تخت باقی رہتا تو یہ ہندوستان کے بہت ہی نیک بادشاہ مانے جاتے۔ مگر جوانی کے دیوانے پن میں بڑے بڑے پارساؤں کا قدم ڈگمگا جاتا ہے۔ میرزا فخرو تو پھر بادشاہ ہند کے بیٹے اور ولیعہد تھے جن کو شباب کی آنکھ مچولیاں کرنے میں کسی کا خوف ولحاظ نہ تھا۔ اسکے علاوہ اس زمانہ میں۔ لال قلعہ خانگی بدچلنی میں اس قدر بدنام تھا جس کی کچھ حد نہیں پھر اگر میرزا فخرو سے کوئی غلطی ہو گئی۔ اور وہ جوش شباب کی مستی کو روک نہ سکے تو کچھ زیادہ گرفت کے قابل نہیں سمجھا جائیگا

میرزا تیغ جمال اسی پہلی اور خفیہ۔ مگر نہایت دلچسپ غلطی کا نتیجہ ہیں۔ ان کے بعد ان کی والدہ سے پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی

تیغ جمال عجب زندہ دل اور خوش طبع شہزادہ ہیں ان کو پنشن نہ ملنے اور شہزادہ مشہور نہ ہونے کا ذرا بھی غم نہیں ہے۔ اور وہ اپنے والدین کے خفیہ تعلقات کو اس لطف سے بیان کرتے ہیں گویا ان کا اس عشق بازی کے نتیجہ سے کچھ ذاتی واسطہ ہی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ اس چھپی ہوئی اور لال قلعہ کی بیگمات میں نہایت مبالغہ آمیز کیفیات کے ساتھ مشہور عشق بازی کا بولتا ہوا حال مقصد ہیں۔

تیغ جمال کہتے ہیں۔ اماں جان کی عمر سولہ برس کی تھی اور ابا جان تیرہ برس سے کچھ مہینے زیادہ کا سن رکھتے تھے۔ جب یہ عشق بازی شروع ہوئی تھی۔ یہ پوچھا جائے کہ جناب تیرہ برس کا بچہ سولہ برس کی عورت سے کیونکر محبت کر سکتا ہے۔ تو سنجیدہ صورت بنا کر کہدیتے ہیں جس طرح اسی برس کا بڈھا سولہ برس کی کم سن عورت سے محبت کا دم بھرا کرتا ہے۔

ہم مغلوں میں بچے بہت جلدی جوان ہو جاتے تھے۔ لڑکیاں تو بعض اوقات دس اور گیارہ سال کی عمر میں نمودِ شباب کا اعلان کر دیتی تھیں۔ اور لڑکے بھی بارہ تیرہ برس کے سن میں عشق و محبت اور اُسکے نتائج پر غور و عمل کرنے لگتے تھے میں خود بارہ برس کا تھا تو آجکل کے اٹھارہ سالہ جوانوں سے زیادہ جذبات اپنے اندر پاتا تھا۔

شیخ جمال نے کہا اماں جان ایک کہار کی لڑکی تھیں۔ نانی اماں کو محل کی کہاریوں میں سب سے دیدار و کہاری کہا جاتا تھا۔ جو حضرت اکبر شاہ ثانی کی نظر کردہ تھیں۔ مگر جو حسن اور جو غمزہ ہائے جانستاں اماں جان رکھتی تھیں وہ نانی اماں کے خواب و خیال میں بھی نہ گزرے ہونگے۔

ہونے کو تو اماں جان بھی محل شاہی کی نوکر تھیں۔ مگر ان کا قیام اکثر خانم کے بازار میں رہتا تھا۔ جہاں نانی اماں۔ نانا ابا اور ہماری ننہیال کے سب کہار رہتے تھے ایک دن کا ذکر ہے کہ ابا جان ڈیوڑھی کے داروغہ کے ساتھ اپنی کمان درست کرانے خانم کے بازار چلے گئے۔ وہاں کہیں اُنھوں نے اماں جان کو دیکھ لیا۔ اور اسی وقت ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ گھر آئے تو اٹوانی کھٹوانی لے کر پڑ گئے۔ اور رونا شروع کیا ہر چند لوگ پوچھتے تھے کہ میاں مزاج کیسا ہے۔ دادی اماں کہتی تھیں۔ بیٹا کسی نے کچھ کہا ہو۔ سنا ہو۔ کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی ہو۔ تو مجھے بتاؤ میں اس کا تدارک کروں۔ مگر یہ تو عشق کے ستائے ہوئے تھے۔ ایک بات منہ سے نہ کہتے تھے۔ اور چپ چاپ پڑے روتے تھے۔

آخر رفتہ رفتہ یہ بات کھُل گئی اور محل میں اس کے مذاق اور چرچے ہونے لگے بیگمات ابا جان کو چھیڑنے لگیں۔ اور ہم سن لڑکوں میں بھی اشارہ بازیاں اور آوازہ کشیاں شروع ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ نانی اماں کو خبر ہوئی تو انھوں نے اماں جان کو

محل میں بلالیا اور دادی اماں کی ڈیوڑھی پر حاضری لکھوادی۔ مگر ابا جان کی حالت یہ تھی کہ باوجود اس سرانجام خاص کے وہ اماں جان سے بات کرتے ہوئے شرماتے تھے اماں جان کبھی اکیلے دکیلے مل جاتیں تو ہنسکر ابا جان کا ہاتھ پکڑ لیتیں اور کہتیں صاحب عالم آپ غمگین کیوں رہتے ہیں۔ تو ابا جان ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاتے۔ اور اماں جان کی طرف مخاطب نہ ہوتے۔

بظاہر تو یہ حالات تھے۔ اندر کی خبر نہیں کیا ہوا۔ اور میرزا تیغ جمال کیونکر پیدا ہو گئے میرزا تیغ جمال کا بیان ہے کہ انکی پیدائش کے وقت اماں سترہ برس کی اور ابا چودہ ساڑھے چودہ سال کے تھے۔

دادی اماں نے بہت چاہا کہ اب اس کہاری کے ہاں میرا پوتا پیدا ہو گیا ہے یہ محل میں بیگمات کی طرح رہے مگر نانی اماں نے اس کو قبول نہ کیا۔ اور اماں جان پھر دریبا خانم کے بازار میں رہنے لگیں۔ میرزا تیغ جمال جب چھ برس کے ہوئے۔ تب وہ لال قلعہ میں اپنے باپ کے پاس آکر رہے وہ کہتے ہیں۔

بھائی ہم کہار ہیں ننھیال کی طرف سے۔ اور بادشاہ ہیں ددھیال کے رشتہ سے وہاں بھی انسانوں کا بوجھ اٹھاتے تھے اور یہاں بھی۔ ہماری برابری کون اس دنیا میں کر سکتا ہے کہ ہماری زندگی خدا کے بندوں کے بوجھ اٹھانے اور خدمت خلق کرنے میں بسر ہوتی ہے۔

غدر کے ۲۰ برس بعد

میرزا تیغ جمال کہتے ہیں۔ غدر کے ایام میں میں اپنی والدہ کے ساتھ دہلی سے بھاگ کر شاہجہاں پور چلے گئے تھے۔ جہاں ہماری ننھیال کا قدیمی کنبہ رہتا تھا۔ قلعہ کی افراتفری دیکھ کر میں نے شہزادوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور اماں کے پاس چلا گیا

کیونکہ شہزادوں کی زندگی اس زمانہ میں دو کوڑی کے برابر بھی نہ تھی۔ مجکو جان کی خیر اسی میں نظر آئی کہ کہاروں میں جاکر رہوں اور کہار کہلاؤں۔

وہ کہتے ہیں کہ اماں جان کے پاس اتنی دولت تھی کہ ہم نے شاہجہانپور میں جاکر ایک دوکان کرلی اور بیس برس بڑے عیش و آرام میں گذارے۔

میں حلوائی کی دکان کرتا تھا۔ ایک دن کسی پٹھان نے مٹھائی کی خرابی بیان کرکے مجکو گالی دی۔ میں شاہی خون کا تھا۔ گالی کی برداشت کیونکر کرتا۔ لوہے کا کھچیہ اٹھاکر پٹھان صاحب کے مارا جس سے وہ چکراکر گر پڑے۔ اور پانچ منٹ کے اندر تڑپ کر مر گئے۔

میں پکڑا گیا۔ اور مدتوں مقدمہ اور حوالات کا جھمیلا برداشت کرکے چودہ برس کی قید کا سزاوار بنا۔

بریلی کا جیلخانہ

پہلے دن جب میں جیلخانہ کے اندر داخل ہوا تو مجھے ذرا بھی پریشانی اور غم اپنے قید ہونے کا نہ تھا۔ کیونکہ شروع سے ہر وقت خوش اور بے فکر رہنے کی عادت تھی اور غم کبھی میرے پاس نہ آنے پاتا تھا۔ قید کا حکم سُننے کے بعد بھی میں خوش رہا اور جب اماں جان ملنے آئیں اور رونے لگیں تو میں نے ہنسکر کہا۔ اے بی۔ تم روتی کیوں ہو۔ دکان میں اتنی مٹھائی چھوڑ آیا ہوں جو کئی مہینے تک کھاتی رہوگی اماں جان بولیں۔ بس تجکو تو ہر وقت مسخرہ پن سوجھتا ہے۔ میرا کون وارث ہے جو چودہ برس تک خبرگیری کریگا۔ میں نے تو تیرے دم کی بدولت اس پردیس میں بیس برس گزار دیئے ورنہ دلی کی سی اس گاؤں میں بات کہاں۔ میں نے جواب دیا۔ جب ابا جان کا سارا خاندان تباہ ہوگیا۔ اور بڑی بڑی حویلیاں خاک میں

ٹل گئیں۔ اور ہمارے شہزادے بھائی تخت سے تختہ پر آگئے تو ہم کس گنتی میں ہیں۔ چودہ سال کی بات ہی کیا ہے پلک مارتے گذر جائینگے۔ اور میں تمہارے پاس آجاؤنگا۔ ذرا میری بیوی کا خیال رکھنا۔ اس کا دل تمہاری بدمزاجی سے میلا نہ ہو۔ تم ملکہ کا سا دماغ رکھتی ہو۔ اور وہ بچاری محض ایک کہاری ہے۔ مہربانی کرکے اس پر شاہانہ مزاج ظاہر نہ کرنا۔ اماں جان یہ گفتگو سنکر ہنسنے لگیں اور یہ کہتی ہوئی چلی گئیں۔ خبر نہیں تو اتنا بے غیرت اور ڈہیٹ کیوں ہے خیر جا خدا کے سپرد کیا

جس وقت مجکو جیل خانہ کے کپڑے پہننے کو دیئے گئے۔ تو میں نے مذاق سے کہا اس جانگیہ کو رہنے دیجئے۔ مجکو اپنا پاجامہ اس سے زیادہ پیارا ہے۔ یہ گفتگو برقنداز جیل کو کب گوارا ہو سکتی تھی۔ اس نے دو تین ڈنڈے رسید کیئے اور کہا یہ تمہاری نانی اماں کا گھر نہیں ہے جو دلگی کی باتیں کرتے ہو۔ میں نے ڈنڈے کھاکر بھی ہنسی کا جواب دیا کہ بھائی نانی اماں کا گھر خانم کے بازار میں تھا۔ وہ تو محلہ کے ساتھ کھود کر برابر کر دیا گیا۔ دادی اماں کا گھر لال قلعہ میں تھا۔ اس میں اب گورے رہتے ہیں۔ میں تو اس کو سسرال سمجھ کر آیا تھا۔ وہاں جوتیاں تو مارا کرتے ہیں ڈنڈے مارنے کبھی نہیں سُنے۔ تم میرے سالے ہو یا سُسر۔

برقنداز آگ ہو گیا اور اس نے دو تین قیدیوں کی امداد سے مجھ کو اتنا مارا کہ میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو ایک کوٹھری کے اندر لیٹا تھا اور برقنداز سامنے کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔ جناب مارنے کا شگون ہو چکا۔ اب اپنی بہن کو یہاں لائیے جو مجکو کھانا دے اور ہلدی چونہ چوٹ پر لگائے۔ برقنداز کو بے اختیار ہنسی آگئی اور اس نے کہا تم آدمی ہو یا پتھر۔ کسی بات کا تم پر اثر نہیں ہوتا۔ میاں یہ جیلخانہ ہے۔ یہاں یہ خوش مذاقیاں قائم نہیں رہ سکتیں۔ تم کو چودہ برس گزارنے ہیں۔ سیدھے ہو کر رہو گے تو خیر ہے۔ ورنہ پٹتے پٹتے چودہ دن کے اندر مر جاؤ گے۔

میں نے کہا مرنے کے بعد بھی آدمی کو قبر کے جیلخانہ میں جانا پڑتا ہے۔ مگر مجکو مردہ پر بڑا غصہ آتا ہے کہ وہ کیوں چپ چاپ کفن اوڑھ کر قبر میں چلا جاتا ہے۔ میں تو مرنے کے بعد بھی خاموش نہ ہونگا۔ اور جو شخص میرے پاس رہیگا اس کو بھی ایسا بنادونگا کہ وہ مرے تو چپکا نہ رہے۔ بلکہ ہنستا بولتا قبر میں جائے۔ اگر تم کو شک ہو تو تم ابھی مرکر دیکھ لو۔ یا کہو تو میں مار ڈالوں۔

برقنداز نے سمجھا یہ کوئی پاگل ہے۔ اور ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجکو چکی خانہ میں لے گئے جہاں ایک چکی پر دو آدمی کھڑے ہوکر آٹا پیستے ہیں۔ میری چکی کا شریک ایک بڈھا آدمی تھا۔ اور شاید نیا نیا قید ہوکر آیا تھا۔ اس واسطے زار و قطار رو رہا تھا۔ میں نے پہلے جھک کر ایک فرشی سلام اُس کو کیا۔ اور اس کے بعد بولا نانا ابا آپ روتے کیوں ہیں۔ فدوی ایک دوغلی قسم کا آدمی ہے۔ آدھا تیموری شہزادہ اور آدھا کہار۔ اور جب آپ کے ہمراہ چکی کا کام کرے گا۔ تو تیسری شاخ میرے اندر اور لگ جائیگی۔ اور وہ یہ کہ پاؤ پُوریہ۔

بڑے میاں نے میری بات پر ذرا توجہ نہ کی۔ ان کو اپنی حالت کا اتنا سخت صدمہ تھا کہ آخر مجھ پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اور میں نے کہا۔ آپ بیٹھ جایئے۔ میں اکیلا چکی چلالونگا۔ اور آپ کے حصہ کا بھی پیس ڈالونگا۔ ان حضرت نے اس کا بھی جواب نہ دیا اور کھڑے روتے رہے۔ لیکن جب برقنداز نے ان کی سفید کتری ہوئی ڈاڑھی پکڑکر ایک طمانچہ مارا اور کہا بس رو چکا۔ کام کر تو بچارے نے آسمان کو دیکھا اور بے اختیار چکی چلانے لگے۔ ان کی اس حالت کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اپنی ساری شوخیاں بھول گیا۔ اور ان کے ساتھ چپ چاپ چکی چلانے لگا۔

کئی روز یہی نوبت رہی میں ہر چند ان سے بات کرتا تھا مگر وہ جواب نہ دیتے تھے اور روتے رہتے تھے۔ آٹھ دن کے بعد انھوں نے اپنی سرگذشت سُنائی۔

شاہ عالم کے پڑپوتے کی داستان

میں میرزا جہانگیر کا بیٹا ہوں جو اکبر ثانی بادشاہ دہلی کے بیٹے شاہ عالم بادشاہ کے پوتے اور بہادر شاہ کے بھائی تھے۔

جب میرے والد میرزا جہانگیر نے سیٹین صاحب انگریز کے گولی ماری تو اُس قصور کے عوض قید ہو کر الہ آباد بھیجے گئے۔ الہ آباد میں اُنھوں نے ایک عقد کر لیا تھا میری والدہ نظر بندی کے افسر پہرہ دار کی لڑکی تھیں۔ نکاح ہونے کے بعد سے لیکر میرے پیدا ہونے تک والد نے میرے نانا اور والدہ کو اتنی دولت دی کہ سات پیڑی کو کفایت کرتی۔ میری دادی اپنے بیٹے کو دہلی سے برابر جواہرات اور اشرفیاں بھیجا کرتی تھیں۔ اور ان کے پاس دولت کی کچھ کمی نہ تھی۔

میں نے والد کے انتقال کے بعد نانا کے پاس پرورش پائی اور ایسے ناز و نعمت سے پلا کہ شاید دنیا میں کوئی بچہ میری طرح آرام سے نہ ہوگا۔ ہوشیار ہوا تو ہر قسم کی تعلیم مجھکو دلائی گئی۔ عربی فارسی کی تکمیل کے بعد میں نے کپڑے کی دکان کر لی۔

دن بھر دوکانداری۔ رات کو خدا کی مہربانی سے تھوڑی عبادت و بیداری میں عمر بسر ہوتی تھی۔ چار بچے خدا نے دیئے۔ بوڑھی والدہ ابتک زندہ ہیں۔

ایک روز ایک تھانہ دار صاحب کچھ کپڑا خریدنے آئے۔ میں نے عادت کے موافق ایک بات قیمت کی کہدی۔ اُنھوں نے حجت شروع کی تو میں نے کہا جناب میری دوکان پر جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ اس پر وہ بدزبان بگڑ کر بولا۔ ترا ایسا تجھ جیسے ٹھگ میں نے بہت سے جیلخانہ میں بھجوا دیئے ہیں۔ میں نے کہا تھانہ دار صاحب زبان سنبھال کر بولیئے۔ شریفوں کی گفتگو ایسی نہیں ہوا کرتی۔ اس پر اسکو اتنا غصہ آیا کہ فوراً ایک تھپڑ بھرے کلہ پر مارا۔ مجھ میں بھی مغلی خون تھا جواب میں وہ تھپڑ

میں نے بھی مار دیئے۔ سپاہیوں نے مجکو پکڑ لیا اور تھانہ لے گئے۔ وہاں تھانہ دار نے مجکو حوالات میں بند کرا کے میرے گھر کی تلاشی لوائی اور چوری کا کپڑا برآمد کرا کے مقدمہ قائم کرویا۔ ہرچند میں نے اپنی بیگناہی ظاہر کی اور حکام سے اصلی واقعات کہے مگر کسی نے نہ سُنا اور چھ ماہ قید سخت کا حکم دیدیا۔

میری بیوی اور ضعیف والدہ نے گھر کا سارا اثاثہ فروخت کر کے مقدمہ میں صرف کردیا۔ اور وہ بچاریاں مفلس ہوگئیں۔ لیکن نتیجہ خاک نہ نکلا اور یہاں جیلخانہ میں آنے کی نوبت آگئی۔

سب سے زیادہ مجھے والدہ کا صدمہ ہے۔ جو مجھ سے حوالات میں ملنے آئی تھیں اور میری یہ حالت دیکھکر آہ کا نعرہ مار کر گر پڑیں۔ اور روح پرواز ہوگئی۔ اُس وقت میرا بڑا لڑکا جس کی عمر بارہ سال کی ہے ان کے ہمراہ تھا۔ وہ گھبرا گیا اور مجھ سے کہنے لگا ابا دادی جان مرگئیں۔ میں چاہتا تھا کہ اماں جان کو جُھک کر دیکھوں۔ مگر ظالم داروغہ کے سپاہی مار کر مجکو جیلخانہ میں لے آئے اور والدہ کی لاش وہیں پڑی رہ گئی چلتے وقت میں نے اپنے لڑکے کو یہ کہتے سُنا۔

ابا جان ہم کہاں جائیں اب یہ سپاہی ہم کو بھی ماریں گے۔ دادی جان کو کیونکر گھر لیجائیں۔ تم ذرا ٹھیرو ابا جی ابا جی۔

میں اس غم میں رات دن گھلا جاتا ہوں خبر نہیں بیوی بچوں پر کیا گزرتی ہوگی اور ظالم تھانہ دار نے ان پر کیسی کیسی زیادتیاں کی ہونگی۔

میرزا تیغ جمال نے یہ سُنکر ایک قہقہہ لگایا۔ اور کہا یہ دنیا بھی عجب مقام ہے میری تمہاری ایک سی حالت ہے اور ایک ہی نسل کا تم میں مجھ میں خون ہے۔ مگر تم غم کے تحت الثرا میں پھنسے ہو۔ اور میں خوشی کے آسمان میں زندگی بسر کرتا ہوں۔

واہ وا ایک صورت کا آدمی ایک کھانا ایک پہننا۔ ایک طرح سونا ایک طرح جاگنا

مگر کسی کو عادت ترسنے ترسانے کی دی۔ کسی کو ترسانے تڑپانے والا بنایا۔ کوئی ہر وقت مغموم رنجیدہ رہتا ہے کوئی صبح سے شام اور شام سے صبح تک سوائے ہنسنے ہنسانے کے کسی غم کے پاس نہیں پھٹکتا۔

بھائی صاحب قید تم بھی کاٹوگے اور میں بھی کاٹوں گا۔ تم کو یہ زندگی دوبھر اور اجیرن معلوم ہوگی۔ اور میں اس کو ذرا بھی خاطر میں نہ لاؤنگا اور مرتے دم تک یوں ہی بشاش بشاش رہونگا۔ جیسا کہ اب ہوں۔

غدر میں
سبزپوش عورت کی لڑائی

دہلی کے دو بڈھے جو غدر ۱۸۵۷ء میں جوان تھے عام طور سے روایت بیان کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں انگریزی فوج نے پہاڑی پر مورچے بنائے تھے۔ اور کشمیری دروازہ کے رخ سے دہلی شہر پر گولہ باری کیجاتی تھی۔ ایک بڑھیا مسلمان عورت سبز لباس پہنے ہوئے شہر کے بازاروں میں آتی اور بلند اور گرجدار آواز سے کہتی تھی۔

آؤ چلو خدا نے تم کو بہشت میں بلایا ہے

شہر کی خلقت یہ صدا سنکر جوق جوق اس کے آس پاس جمع ہو جاتی تھی اور وہ سب کو لیکر کشمیری دروازہ پر دھاوا کرتی اور شہر والوں کو صبح سے شام تک خوب لڑاتی تھی بعض لوگ چشم دید قصہ کہتے ہیں کہ اس عورت میں غضب کی دلیری تھی۔ اس کو موت کا کچھ بھی خوف نہ تھا۔ وہ گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بہادر سپاہیوں

کی طرح آگے بڑھی چلی جاتی تھی۔

کبھی اس کو پیدل دیکھا جاتا تھا۔ اور کبھی گھوڑے پر سوار۔ اس کے پاس تلوار بندوق اور ایک جھنڈا ہوتا تھا۔ بندوق بہت عمدگی سے چلاتی تھی۔ اور جو لوگ اس کے ہمراہ پہاڑی سے موسیچہ تک گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک شخص نے کہا کہ وہ تلوار چلانے کے فن سے بھی اچھی واقفیت رکھتی تھی۔ اور بار ہا دیکھا گیا کہ اس نے سامنے والی فوج سے دست بدست تیغ زنی کی۔

اس عورت کی جرارت وہمت کو دیکھکر شہر کے عوام میں بڑا جوش پیدا ہو جاتا تھا اور وہ بڑھ بڑھ کے حملے کرتے تھے۔ مگر لڑائی سے ناواقف ہونے کے سبب عموماً ان کو بھاگنا پڑتا تھا۔ اور جب وہ بھاگتے تو یہ عورت ان کو بہت روکتی اور آخر مجبور ہو کر خود بھی واپس چلی آتی۔ مگر واپس آنے کے بعد پھر کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ وہ کہاں چلی جاتی ہے۔ اور پھر کہاں سے آتی ہے۔

آخر اسی طرح ایک دن ایسا ہوا کہ وہ جوش میں بھری ہوئی حملہ کرتی بندوق مارتی تلوار چلاتی موسیچہ تک پہنچ گئی۔ اور وہاں زخمی ہو کر گھوڑے سے گری۔ انگریزی فوج نے اسکو گرفتار کر لیا۔ پھر کسی کو معلوم نہوا کہ وہ کہاں گئی اور اسکا کیا حشر ہوا۔

غدر کے ایک انگریز افسر کی شہادت

صوبہ دہلی کی گورنمنٹ نے انگریزی کے چند خطوط چھاپے ہیں۔ جو ایام محاصرہ دہلی میں انگریزی فوج کے افسروں نے لکھے تھے۔ ان خطوط میں ایک خط لفٹنٹ ڈبلو ایس آر ہڈسن صاحب کا ہے۔ جو انھوں نے دہلی کیمپ سے ۲۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو مسٹر جے گلس فارسائتہ ڈپٹی کمشنر انبالہ کے نام بھیجا تھا۔ اس خط میں مسلمان بڑھیا کی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے خط کا اردو مفہوم یہ ہے۔

"مائی ڈیر فارسائیتہ - میں تمہارے پاس ایک بڑھیا مسلمان عورت کو روانہ کرتا ہوں یہ عجیب قسم کی عورت ہے۔ اس کا کام یہ تھا کہ سبز لباس پہنکر شہر کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرتی تھی۔ اور خود ہتیار باندھکر اُنکی کمان کرتی ہوئی ہمارے مورچہ پر حملہ لاتی تھی۔

جن سپاہیوں سے اسکا سابقہ پڑا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس نے بارہا دلیرانہ اور مردانہ حملے کئے۔ اور مستعدی سے ہتیار چلائے۔ اور اس میں پانچ مردوں کی برابر طاقت ہے۔

جس روز گرفتار ہوئی۔ اُس دن یہ گھوڑے پر سوار تھی۔ اور شہر کے باغیوں کو فوجی ترتیب سے لڑا رہی تھی۔ اس کے پاس بندوق تھی جس سے اس نے بہت سے نشانے مارے اور سپاہی کہتے ہیں کہ تلوار اور بندوق کے وار سے خود اس نے ہمارے بہت سے آدمی قتل کر ڈالے۔ مگر جیسا کہ امید تھی اسکے ساتھی بھاگ گئے اور یہ زخمی ہوکر گرفتار ہوئی۔

جنرل صاحب کے سامنے پیش ہوئی تو اُنہوں نے عورت سمجھ کر اسکے رہا کردینے کا حکم دیا۔ مگر میں نے اُن کو روکا اور کہا کہ اگر یہ رہا ہوگئی تو شہر میں جاکر اپنی باطنی اور غیبی طاقت کا دعوے کریگی اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو اسکی رہائی کسی مخفی اثر کا نتیجہ معلوم ہوگی۔ اور ممکن ہے کہ اس سے یہ عورت فرانس کی اس مشہور عورت کی طرح ہمارے واسطے باعث تکلیف ہوجائے جس کا ذکر انقلاب فرانس کی تاریخ میں مذکور ہے۔ (انقلاب فرانس کے ایام میں ایک عورت اسی طرح دشمنوں سے لڑی تھی۔ اور ہزاروں آدمی اس کو غیبی اور آسمانی قوت کا ظہور سمجھکر اسکے ساتھ ہو گئے تھے۔ جس سے بڑا سخت کشت و خون ہوا تھا اور عوام اسکو ناقابل ہلاکت تصور کرنے لگے تھے آخر فرانس کی حریف فوج نے اس کو زندہ جلا دیا تھا۔ جب یہ فتنہ دبا تھا۔ اسی عورت کی طرف خط میں اشارہ کیا گیا ہے۔ حسن نظامی)

جنرل صاحب نے میرے مشورے کو قبول کیا اور اس عورت کے قید کرنے کی تجویز قرار پائی لہذا آپکی خدمت میں اُس کو روانہ کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ آپ اسکی حراست کا معقول بندوبست کرینگے۔ کیونکہ یہ ڈاین بہت ہی اندیشناک عورت ہے۔　　ہڈسن "

سبز پوش عورت کی حقیقت

دہلی کی عام روایتوں اور اس سرکاری افسر کے خط کی تصدیق کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ اس سبز پوش عورت کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ مگر قابل اطمینان بیان ایک بھی میسر نہ آیا۔ جو لوگ اس عورت سے واقف ہیں وہ اسی قدر بیان کر سکتے ہیں کہ ہم نے اس کو جوش دلاتے اور عوام کو جمع کر کے لڑانے کو لیجاتے دیکھا۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی۔

البتہ ایک قصہ ایسا سنا ہے جو اس واقعہ سے تھوڑا بہت متعلق معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ وہی عورت ہو جسکا ذکر کرنا مقصود ہے۔

ریاست ٹونک کے ایک صاحب نے بیان کیا کہ ان کے والد حضرت حاجی لال محمد صاحب چشتی نظامی کے مرید تھے۔ حاجی صاحب حضرت مولانا فخر الدین چشتی نظامی دہلوی کے خلیفہ تھے۔ اور ان کا مزار درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رضہ کے مشرقی دروازہ میں داخل ہوتے ہی سنگ مرمر کے ایک کٹہرے میں نظر آتا ہے۔

ٹونک کے راوی کا بیان ہے کہ میرے والد حاجی صاحب کے ہاتھ پر بمقام اجمیر شریف مرید ہوئے تھے۔ اور جس وقت اُنھوں نے بیعت کی تو ایک مجذوب نما عورت حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچی تھی۔ اور کہہ رہی تھی کہ میرے لئے شہید ہونے کی دعا مانگو۔ اسکی درخواست کے الفاظ تو بالکل ہوش و حواس میں ادا ہوتے تھے۔ مگر اسکی حرکتیں دیوانوں کی سی تھیں۔

حاجی صاحب نے دیر تک کچھ جواب نہ دیا اور آخر جوش میں آکر فرمایا۔

"نفس پر جہاد کر کہ اس سے بڑھ کر کوئی جنگ نہیں ہے"

عورت نے کہا تو کیا نفس مجکو قتل کریگا۔ جب شہادت پاؤنگی تو میں نفس کو قتل کرونگی اور نفس کے غلاموں سے شہادت لونگی۔

اس پر حاجی صاحب نے تبسم فرمایا۔ اور کچھ دیر تک سکوت کرکے ارشاد کیا۔

"مہندی کے پتے سبز ہیں۔ مگر باطن سُرخ رکھتے ہیں۔ جا سبز ہو اور سُرخ بن"

یہ استعارہ ہم سب لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ مگر وہ عورت قدموں پر گر پڑی اور انکو بوسہ دیکر کہیں چلی گئی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے حضرت حاجی صاحب کا مطلب سمجھ لیا۔ اور جو چاہتی تھی وہ اس کو مل گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد میں نے اس عورت کو درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحبؒ میں دیکھا۔ کہ سبز لباس پہنے ہوئے حضرت مولانا فخرؒ صاحب کے مزار پر مراقب بیٹھی ہے جب وہ فارغ ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم وہی عورت ہو جسکو میں نے اجمیر شریف میں دیکھا تھا تو اس نے کہا ہاں بھائی میں وہی ہوں اور تمہاری پیر بہن ہوں۔

میں نے کہا آہا ہا۔ کیا تم بھی حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو۔ بولی ہاں میں اُنہی کی لونڈی ہوں میں نے پوچھا۔ تمہارا مکان کہاں ہے اور یہ درویشی کب سے لی تو اس نے اپنا قصہ اس طرح بیان کیا۔

میرے دادا احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں سردار تھے جب مرہٹوں سے پانی پت پر لڑائی ہوئی ہے تو وہ اس میں موجود تھے۔ اور اسی میں شہید ہوئے۔ میرے والد بھی احمد شاہ کی فوج میں تھے۔ مگر انکی عمر اُسوقت بہت چھوٹی تھی اپنی بیوہ والدہ کے ہمراہ کچھ دن لاہور میں رہے اور اس کے بعد ریاست بھاولپور چلے گئے۔ جہاں معمولی نوکری سے گزرا وقات کی اور وہیں انکی شادی ہوئی میرے دو بھائی ہوئے تھے۔ مگر زندہ نہ رہے ان کے بعد میں پیدا ہوئی۔ اور ابتدائی عمر بھاولپور میں گزری اس کے بعد والدین کے ہمراہ ریاست جے پور میں آگئی۔ جہاں میرے والد نے نوکری کرلی تھی۔ یہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ اور میں نے راجہ صاحب کے ایک مسلمان چوبدار سے شادی کرلی۔

ہند الولی کا حکم

میرا شوہر بیمار تھا۔ اور زندگی کی کچھ امید نہ رہی تھی۔ میں اسکے سرہانے بیٹھی دعائیں مانگ رہی تھی کہ بے اختیار میری زبان پر ہند الولی حضرت خواجہ معین الدین چشتی رضٰ کا نام آیا کہ الٰہی ان کے صدقہ سے میرے خاوند کو اچھا کردے دعا کرتے کرتے میں سو گئی تو خواب میں دیکھا۔

چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے اور خلقت بجھانے کو اس پر پانی ڈالتی ہے تو وہ پانی ہی آگ کا شعلہ بنکر برتنوں سے نکلتا ہے۔ میں اس منظر کو دیکھکر گھبرا گئی۔ تو سامنے ایک بزرگ کو کھڑا دیکھا جو فرماتے ہیں۔ اری او عورت اپنا سر قربان کر جب یہ آگ فرو ہو گی۔ میں نے عرض کیا۔ کیونکر سر کو قربان کروں۔ ان بزرگ نے فرمایا کیا تو شہید ہونا نہیں جانتی یہ کہکر انھوں نے ایک سبز چادر مجکو دیا کہ اس کو اوڑھ لے۔ میں نے جوں ہی اسکو اوڑھا ہوا میں اڑ گئی۔ جوں جوں اوپر اڑتی تھی چاروں طرف سے آوازیں آتی تھیں کہ یہ شہید ہے یہ شہید ہے یہ سنتے ہی آنکھ کھل گئی۔

دیکھا تو شوہر سکرات میں تھا۔ اور اسی میں اسکی رحلت ہو گئی۔

خاوند کے مرنے سے مجکو بہت صدمہ ہوا۔ اور میں کچھ دیوانی سی ہو گئی اور اجمیر شریف جا کر رہنے لگی۔ وہیں حضرت حاجی صاحب کی زیارت نصیب ہوئی اور میں نے ان سے بیعت کر لی۔ اب میں اکیلی تھی۔ کیونکہ والدین پہلے مر چکے تھے۔

اسدن سے میرے دل میں یہی سمائی ہے کہ ہند الولی خواجہ اجمیری نے مجکو شہید ہونے کا حکم دیا ہے۔ اور خواب میں انہی کی زیارت مجکو میسر آئی تھی۔

اب میں دہلی کی زیارتیں کرنے آئی ہوں۔ اور زیادہ حصہ دادا پیر (یعنی حضرت مولانا فخر صاحب) کے مزار پر رہتی ہوں۔

پرسوں دادا پیر صاحب خود خواب میں آئے تھے۔ اُنھوں نے فرمایا تو سبز پوش شہید ہے۔

ٹونک والے صاحب کا بیان ہے کہ اس عورت کی یہ عجیب باتیں سُنکر میں واپس چلا آیا اور اس سے کچھ دن بعد دہلی میں غدر ہو گیا۔

اس حکایت سے خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ سبز پوش عورت جس کا ذکر غدر دہلی کے قصہ میں آیا ہے یہی ہو۔ اور اسی نے اپنے دماغی جنون کے سبب یہ حرکت کی ہو۔

قدرت کے اسرار

اگر واقعی غدر میں انگریزی فوج سے لڑنے والی اور عوام کو لڑائی پر آمادہ کرنیوالی یہی عورت تھی تو تاریخ میں یہ ایک عجیب واقعہ سمجھا جائیگا۔

مگر میرا خیال ہے کہ ٹونک والے صاحب نے جس عورت کا قصہ بیان کیا۔ وہ اس عورت سے جو غدر دہلی میں نمودار ہوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتا۔

کیونکہ حاجی لال صاحب کی مرید عورت گو سپاہی کی پوتی اور بیٹی تھی۔ مگر ایسے واقعات موجود نہیں ہیں جن سے یہ ثابت ہو کہ اس نے بندوق اور تلوار چلانا کہاں سیکھا۔ نہ ایسی وجوہات معلوم ہوئیں جو سبز پوش عورت کو گھوڑے پر سوار ہونے اور لڑائی کے قواعد جاننے کی شہادت دے سکیں۔ ایک ایسی عورت جسکی بیان شدہ زندگی میں کہیں بھی فوجی معروفیت کا ذکر نہیں پایا جاتا یکایک ایسی تو عدداں اور گھوڑے سوار ہتھیار چلانے والی کیونکر بن گئی۔ لہذا میں سمجھتا ہوں کہ غدر کی لڑاکا عورت کوئی اور ہو گی۔ جس کو حاجی لال صاحب کی مریدہ سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

البتہ ایک خفیف شبہ ہو سکتا ہے کہ حاجی لال صاحب کی مریدہ بوجہ موروثی سپاہی ہونے اور شہادت کے خیال میں محو رہنے کے سبب ممکن ہے غدر کے ہنگامہ سے متاثر ہوئی ہو اور باغی

افواج میں شریک ہو کر اس نے گھوڑے کی سواری اور ہتھیار چلانا سیکھ لیا ہو اور فوجوں کے فرار کے بعد جوشِ شہادت میں از خود رفتہ ہو کر دہلی کے عام شہریوں کو لڑائی پر آمادہ کیا ہو۔
یا ممکن ہے کہ غدر کے بانی لوگوں نے ایک نیم عقل اور شہادت کی شوقین عورت کو شکار کھیلنے کی ٹٹی بنا لیا ہو۔ اور انہی کی سعی سے اس نے لڑائی کے ہنر سیکھے ہوں۔
بہر حال یہ عورت کوئی بھی ہو۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس کا واقعہ قدرت کے اسرار میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اور غدر کی تاریخ لکھنے والوں نے اگر اس عجیب قصّہ کو نہیں لکھا تو ایک دلچسپ حصّہ چھوڑ دینے کا جرم ان سے سرزد ہوا۔
ایشیا اور ہندوستان میں مذہبی عقائد اور بعض اوقات محض خیالی توہمات ایسے ایسے شاندار کام کر جاتے ہیں جنکے سامنے عقل و تدبیر حیران رہجاتی ہے۔
اگر غدر کی سبز پوش عورت سے۔ بلوہ فساد کے علاوہ کسی جائز فوجی کام میں مدلیجاتی یا اس کو تاریخ میں کوئی اور کام کرنے کا موقع ملتا تو اس کا نام بھی چاند بی بی اور رضیہ بیگم اور نور جہاں کی طرح مشہور ہو جاتا۔
مجھکو مسٹر ہڈسن کی اس تحریر سے اتفاق ہے کہ اگر جنرل صاحب اس سبز پوش عورت کو رہا کر دیتے اور مسٹر ہڈسن کا کہنا نہ مانتے۔ تو یقیناً وہ عورت انگریزی فوج کو کسی دوسری صورت سے عرصہ کا نیک پریشان کرتی۔ اور کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں بجھے ہوئے جوشِ انقلاب کو پھر ایک نئی صورت سے زندہ کر دیتی۔ پھر اس دوسرے تلاطم کا مقابلہ انگریزوں کو آسان نہ ہوتا اور معلوم نہیں حالات کیسے کیا ہو جاتے۔
میں چاہتا ہوں کہ اور کسی ہندوستانی کی نظر سے کسی انگریزی یا دیسی تاریخ میں اس سبز پوش عورت کا قصّہ گزرا ہو۔ اور میرے بیان سے زائد حالات معلوم ہوئے ہوں تو وہ مجھکو مطلع فرمائیں۔ تاکہ میں تاریخ غدر دہلی میں ان کو درج کر دوں۔
سبز پوش عورت کو ہر ہندوستانی۔ اس کی دلیری اور جرأت اور مردانہ فوجی کمان کے

واقعہ کو فخر سے یاد رکھنا پسند کریگا۔ اور چاہیگا کہ اس عورت کے اور حالات بھی معلوم ہوں۔ تاکہ ہندوستان کا فخر ایک جائز حد کے اندر ہمیشہ برقرار رہے۔

کھنی

"دلشاد گدگدیاں نہ کر۔ مجھے سونے دے، نماز قضا ہوتی ہے تو کیا کروں آنکھ کھولنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"بیوی گدگدیاں سینے نہیں کیں یہ گلاب کا پھول تمہارے تلووں سے آنکھیں مل رہا ہے۔"

"میں اس پھول کو مسل ڈالوں گی۔ اتنے سویرے مجھے کیوں جگائی ہے۔ میرا دل ابھی سونے کو چاہتا ہے۔ ذرا سندری کو بلا بانسلی بجائے۔ ہلکے سروں میں بھیرویں سنائے۔ گل چمن کہاں ہے چپی کرے۔ تو کوئی کہانی شروع کر۔"

کہانی کہوں گی تو مسافر راستہ بھولیں گے۔ دن کو کہانی نہیں کہنی چاہئے۔ سندری حاضر ہے گل چمن کو بلاتی ہوں۔ اماں جان آجائینگی تو خفا ہونگی کہ مہ جمال کو ابتک بیدار نہیں کیا نماز کا وقت جاتا ہے۔"

سندری بانسلی بجارہی تھی کہ مہ جمال نے آنکھیں کھولدیں بالوں کو سمیٹا مسکرائی کلمہ پڑھا۔ نرگس نے سلام کیا۔ جواب میں اُسکے ایک چٹکی لیگئی انگڑائی لیکر اُٹھ بیٹھی اور کہا۔

"دلشاد۔ ہمنے نرگس کے چٹکی لی تو یہ ہنسی نہیں۔ منہ بنالیا۔ آتو آ۔ تیرے کان مروڑ دوں اور تو خوب ہنس۔"

دلشاد، اُٹھکر بھاگی دور کھڑی ہوئی اور کہا۔ "لیجئے میں کھلکھلاکر ہنستی ہوں آپ سمجھ لیجئے کان مروڑ دیئے۔"

مہ جمال نے پھر انگڑائی لی۔ اور مسکراتی ہوئی طشت چوکی پر گئی۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی صحن میں نکلی باغ کے پاس تخت پر بیٹھی۔ قرآن شریف شروع کیا سب لونڈیاں فرش کی

درستی میں مصروف ہوئیں۔ ناشتہ کا سامان کرنے لگیں۔

مہ جمال تلاوت سے فارغ ہوئی تو مالن چنگیر میں چند ہری مرچیں لئے حاضر ہوئی پہلے مہ جمال کی بلائیں لیں دعائیں دیں۔ پھر بولی "سرکار آج حضور کے لگائے ہوئے پودوں میں یہ مرچیں لگی تھیں نذر کے لئے لائی ہوں"

مہ جمال نے چنگیر لے لی۔ سب لونڈیوں کو پکارا۔ اور مرچوں کی آمد سے محل میں ایک دھوم مچ گئی۔ نرگس نے کہا "کیسی ہری ہری چکنی چکنی صورت ہے" دلشاد بولی "جیسے بیوی کے گال" سندری نے کہا "کیسی چپ چاپ چنگیر میں لیٹی ہیں جیسے بیوی چھپر کھٹ میں سوتی ہیں" گلبدن بولی "ڈالی سے ٹوٹی ہیں گھر سے چھوٹی ہیں اسلئے ذرا چپ چپ ہیں"

مہ جمال نے کہا "مالن کو جوڑا دو کپڑے پہناؤ۔ پانچ روپئے نقد بھی دینا۔ میرے درختوں کا پہلا پھل لائی ہے۔ اس کا منہ بھی میٹھا کرنا"

مالن کو ریشمی جوڑا ملا۔ چاندی کے کڑے پہنائے گئے۔ لڈو کھلائے گئے پانچ روپئے نقد اور ایک پان کا بیڑا ملا۔ وہ دعائیں دیتی ہوئی اپنے گھر گئی۔ یہاں اماں جان کو لونڈی خبر دینے پہنچی کہ بیوی کے درختوں کا پہلا پھل آیا ہے۔ وہ برابر کے مکان سے آئیں مغلانی ساتھ تھیں۔ بیٹی کی بلائیں لیں۔ مہ جمال نے آداب کیا۔ اماں اور مغلانی نے مرچوں کی خوب تعریفیں کیں اور تھوڑی دیر تک مرچوں کا غلغلہ گھر میں برپا رہا۔

مہ جمال خورشید جمال کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے والد میرزا علی گوہر عرف نیلی شاہ عالم کے بیٹے اکبر شاہ ثانی کے بھائی تھے جو مر چکے تھے۔ خواصوں سے ان کے کئی بچے تھے مگر بیگم سے صرف مہ جمال ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ اور وہ بھی بڑھاپا آجانیکے بعد جب میرزا نیلی مرے ہیں تو مہ جمال کی عمر پانچ سال کی تھی۔ اب ماشاء اللہ سترھوے سال میں ہے۔ صورت سانولی ہے چہرہ کتابی ہے۔ قد میانہ ہے آنکھیں سیاہ اور بیحد رسیلی اور مخمور ہیں۔ آواز میں قدرتی درد ہے جب ہنسکر بولتی ہے تو یہ معلوم ہوتاہے کہ کوئی

مرثیہ پڑھا گیا۔ سنکر کلیجے پر چوٹ لگتی ہے۔ وہ بہت چنچل۔ شوخ آرام طلب اور نازک مزاج ہے لاڈ پیار میں پلی ہے۔ شہزادی ہے۔ بن باپ کی ہے۔ اکلوتی ہے اور کچھ فطرتاً ضدی اور ہٹیلی ہے۔ بدن بہت دُبلا ہے۔ چلتی ہے تو غیر مصنوعی انداز سے بدن کو جھکاتی۔ پھولوں کی ٹہنی کی طرح ادہر ادہر جھکولے کھاتی ہوئی چلتی ہے ٹھوکریں قدم قدم پر لگتی ہیں۔ لونڈیاں ساتھ دوڑتی ہیں بسم اللہ یا اللہ خیر کہتی جاتی ہیں"

پھول والوں کی سیر تھی۔ بہادر شاہ اپنے نئے محل میں جو درگاہ حضرت خواجہ قطب صاحب کے دروازہ کے قریب بنا تھا تشریف رکھتے تھے۔ بیگمات اندر تھیں۔ مگر خورشید جمال اور مہ جمال نے دوسرا مکان لیا تھا۔ کیونکہ میرزا نیلی کے وقت سے انکی اور بہادر شاہ کی اَن بن تھی۔ بہادر شاہ کو انگریز لاکھ روپیہ مہینہ دیتے تھے۔ اس میں سے ایک ہزار روپئے مہینہ خورشید جمال کا علیٰحدہ بھیجا جاتا تھا سستا سماں تھا۔ ہزار روپئے آجکل کے لاکھ روپیہ کی برابر تھے۔ اور خورشید جمال خوب عیش آرام سے زندگی بسر کرتی تھیں۔ جس شام کو پنکھا چڑھا۔ مہ جمال عصر کے وقت سے برآمدہ میں چلمن کے پاس بیٹھی تھی۔ نفیری بج رہی تھی۔ دہلی کے ہندو مسلمان زرق برق کپڑے پہنے پنکھے کے ساتھ تھے۔ دوکانیں آراستہ تھیں۔ سقّے کٹورے بجا رہے تھے۔

مغرب کا وقت آیا تو خورشید جمال نے لونڈیوں سے کہلا بھیجا کہ بیبی آن کر نماز پڑھ لو پھر تماشا دیکھنا۔ مہ جمال اٹھی تو چلتے وقت اُس نے دیکھا ایک فقیر سفید کفنی پہنے زرد چہرہ ننگے سر ننگے پاؤں پنکھے کے پاس سے گزر کر اس کو دیکھتا ہوا چلا گیا۔ اس کی صورت اور کفنی دیکھ مہ جمال ڈر گئی۔ نماز میں بھی اسی کا خیال رہا۔ سیر سے فارغ ہو کر سوئی تو رات کو بھی کفنی کئی دفعہ خواب میں دکھائی دی۔ صبح ہوئی تو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ماں کو خبر ہوئی اس نے کچھ پڑھ پڑھ کر دم کیا۔ صندوقچہ سے ایک نقش نکالکر گلے میں ڈالا۔ فقیروں کو خیرات بھجوائی۔

دوپہر کو بخار تیز ہوگیا۔ مہ جمال چونکتی تھی اور کہتی تھی "وہ کفنی والا آیا۔ وہ مجکو بُلاتا ہے۔ اماں جی آنا وہ دیکھو کھڑا مسکراتا ہے"

ماں نے لونڈیوں سے پوچھا۔ اُنھوں نے کہا۔ ایک فقیر کل شام کو کفنی پہنے جاتا تھا بیوی نماز کے لئے اُٹھیں تو چلمن کا پردہ ہٹ گیا۔ فقیر نے ان کو گھور کر دیکھا۔ او بیوی نے اس کو دیکھا۔ اِس کے بعد وہ کہیں چلا گیا۔

خورشید جمال نے نوکروں کو حکم دیا کہ اِس حلیہ کا فقیر جہاں ملے اُس کو لاؤ۔ نوکر سارے میلے میں ڈھونڈھتے پھرے۔ شام کے قریب وہ فقیر ملا۔ اس کو ساتھ لیکر مکان پر آئے۔ خورشید جمال نے پردہ کے پاس بٹھاکر لڑکی کا حال کہا۔ وہ بولا مجھے اندر لیچلو میں دم کردونگا اچھی ہوجائیگی۔

خورشید جمال نے اندر پردہ کرایا۔ فقیر کو پلنگ کے پاس کھڑا کیا۔ اُس نے آنکھ بند کر کے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھے۔ اور کچھ دیر چپ کھڑا رہا۔ اور پھر کہا "لو لڑکی اچھی ہوگئی"

دیکھا تو واقعی بخار اُتر گیا تھا۔ مہ جمال اُٹھ بیٹھی۔ خورشید جمال اور سب لونڈیاں حیران ہوگئیں۔ فقیر کو بٹھایا کچھ روپے اور کپڑے کے دو تھان نذر پیش کئے فقیر نے کہا "میں نہیں لیتا مجھے لڑکی کی صورت دکھادو ورنہ پھر بیمار ہوجائیگی"

خورشید جمال نے پہلے تو کچھ تامل کیا۔ مگر پھر خیال آیا کہ فقیر تو ماں باپ ہوتے ہیں پردہ ہٹادیا۔ مہ جمال نے فقیر کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔ فقیر نے مہ جمال کو دیکھا اور برابر دیکھتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد "بھلا ہو بابا" کہکر اُٹھا اور چلا گیا۔

یہ تیس برس کا جوان تھا۔ مگر بیمار معلوم ہوتا تھا۔ چہرہ پر زردی بہت زیادہ تھی سفید کفنی کے سوا کوئی کپڑا پاس نہ تھا۔ آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا بہت رونے سے سوج گئی ہیں یہ شخص اُس مالن کا بیٹا تھا جو مہ جمال کے باغ کی محافظ تھی مہ جمال کو ایک سال پہلے

اُس نے باغ میں دیکھا تھا۔ اپنی غریبی اور مہ جمال کی شان کا خیال کر کے اسکو ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس تکلیف کو کسی کے سامنے بیان کرے جو مہ جمال کے دیکھنے سے خودبخود اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔

چھ مہینے وہ اس خلجان میں پریشان رہا۔ اس کے بعد اس کو ایک ہندو جوگی ملا جس سے اُسنے اپنا حال بیان کیا۔ جوگی نے ایک سفید کفنی دی کہ اسکو پہن لے تیرے سب کام پورے ہو جائینگے۔ کفنی پہنتے ہی وہ نیم مجذوب ہو گیا اور گھر بار چھوڑ کر جنگل میں نکل گیا چھ مہینے تک جنگلوں میں پھرتا رہا۔ چھ ماہ کے بعد اب وہ پھر آبادی میں آیا تھا جہاں اُس نے پھر مہ جمال کو دیکھا۔ مگر اب اس کے دیکھنے میں ایسی قوت پیدا ہو گئی تھی کہ مہ جمال کو اس نے ایک نگاہ میں بیمار کر دیا

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ایک رتھ نجف گڑھ کے قریب کھڑا تھا۔ اور خاکی وردی کے فوجی سپاہی اسکو گھیرے ہوئے تھے۔ یہ سب لشکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اس رتھ میں خورشید جمال بیگم مہ جمال اور دو لونڈیاں سوار تھیں باہر چار نوکر تلواریں لئے کھڑے تھے۔ فوج والے کہتے تھے ہم اندر کی تلاشی لیں گے۔ اس میں کوئی باغی پوشیدہ ہے۔ بیگم کے نوکر کہتے تھے۔ اندر عورتیں ہیں ہم پردہ نہ کھولنے دینگے۔ نوبت لڑائی کی پہنچی نوکروں نے تلوار چلائی اور وہ سب ایسے لڑے کہ ایک بھی زندہ نہ بچا۔ فوجیوں نے رتھ کا پردہ اُلٹ دیا۔ عورتوں کو دیکھا اور زیور کا صندوقچہ ان سے چھین لیا۔ اس کے علاوہ اور جسقدر اسباب تھا وہ بھی لوٹ کر آگے بڑھ گئے۔ رتھبان بھاگ گیا تھا۔ بیگم لونڈیوں کو لیکر نجف گڈھ کی طرف چلیں کہ اتنے میں چند گوجر لٹھ لئے ہوئے آئے اور ان سے زیور اور کپڑے مانگنے لگے بیگم نے کہا ہمکو تو فوج والوں نے لوٹ لیا ہے۔ اب ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ تم رتھ اور بیل لے لو۔ مگر گوجر نہ مانے اور اُنھوں نے زبردستی اُنکے برقعے اُتار ڈالے۔ پاجاموں کے سوا تمام کپڑے چھین لئے۔ خورشید جمال اور لونڈیوں نے ان کو بُرا کہنا شروع کیا۔ ایک گوجر نے خورشید جمال کے سر پر لکڑی ماری اور دوسرے نے لونڈیوں پر لکڑیوں کے وار کئے مہ جمال

ڈری سہمی چپ کھڑی تھی۔ اسکو کسی نے نہ چھیڑا۔ خورشید جمال کا سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ تڑپ کر مر گئیں لونڈیاں بھی دونوں چوٹ کے صدمے سے تمام ہو گئیں۔ مہ جمال اکیلی کھڑی تماشہ دیکھتی تھی ماں کو مرتے دیکھا تو چیخکر رونے لگی۔ گوجر تو مار کوٹ کر چلے گئے اور مہ جمال روتے روتے بیہوش ہو گئی

ہوش آیا تو اُس نے دیکھا نہ اس کی ماں کی لاش ہے نہ لونڈیوں کی لاشیں ہیں۔ نہ وہ جنگل ہے بلکہ وہ ایک گھر کے اندر چارپائی پر لیٹی ہے۔ سامنے ایک گائے بندھی کھڑی ہے چند مرغیاں صحن میں پھر رہی ہیں اور ایک میواتی چالیس پچاس برس کی عمر کا سامنے بیٹھا اپنی بیوی سے باتیں کر رہا ہے۔ مہ جمال کو پھر رونا آ گیا۔ اور اُس نے میواتی کی بیوی سے مخاطب ہو کر پوچھا ”میری اماں کہاں گئیں“ میواتن نے کہا ”وہ مر گئیں تھیں انکو دفن کر دیا گیا۔ تم کو یہاں لائے ہیں تم کچھ کھاؤ گی۔ لو کھیر پکی ہے کھاؤ“

مہ جمال نے کہا مجھے بھوک نہیں ہے۔ اور ہچکیاں لے لیکر رونے لگی۔ میواتن پاس آ گئی اور اسے دلاسا دینا شروع کیا اور کہا بیٹی صبر کر رونے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تیری ماں زندہ نہیں ہو سکتی ہمارے اولاد نہیں ہے بیٹی بنا کر رکھینگے۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ۔ تو کون ہے تیرا باپ کہاں ہے اور تو کہاں جاتی تھی“

مہ جمال نے کہا ”میں دلی کے بادشاہ کے خاندان میں ہوں۔ میرے ابا جان گیارہ برس ہوئے مر گئے ہم غدر کی بھاگڑ میں گھر سے نکلے تھے بخت گڈھ میں ہمارے باغ کا مالی رہتا ہے اسکے گھر میں جانا چاہتے تھے کہ راستہ میں پہلے فوج والوں نے لوٹا۔ پھر گوجروں نے اماں جان اور دو لونڈیوں کو مار ڈالا“ کہتے کہتے وہ پھر رونے لگی۔

چند روز مہ جمال میواتن کے ہاں آرام سے دن گزارتی رہی گرچہ وہ پچھلے وقت کو یاد کرکے روتی تھی لیکن میواتن کی محبت کے سبب اسکو کسی بات کی تکلیف نہ تھی پکی پکائی روٹی ملجاتی تھی تاہم مہ جمال کو یہ گھر اور اسکی سادگی کاٹے کھاتی تھی اور وہ پچھلے زمانہ کا عیش یاد آتا تھا۔

ایک رات کو مہ جمال اور میواتن اور اس کا خاوند اپنے مکان میں سوتے تھے کہ پڑوس کے

ایک چھپر میں آگ لگ گئی اور وہاں سے بڑہکر ان کے چھپر میں بھی آن لگی۔ دہوئیں کی بو سے مہ جمال کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ چیختی ہوئی اُٹھی میواتن اور میواتی کا کچھ زیور گھر کے اندر رکھا تھا وہ اسکو لینے کے لئے اندر بھاگے اور مہ جمال گھر کے باہر بھاگی۔ کوٹھے کا جلتا ہوا چھپر گر پڑا اور وہ دونوں اسکے اندر جلکر مر گئے قصبے والوں نے بمشکل آگ بجھائی۔ مگر مہ جمال کا یہ ٹھکانا بھی خاک کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔

صبح جلی ہوئی لاشیں قصبے والوں نے دفن کیں۔ اور مہ جمال کو ایک نمبردار اپنے گھر میں لے گیا۔ اس کے کئی بچے تھے اور دو بیویاں تھیں۔ مہ جمال کو ایک چارپائی سونے کو دیدی گئی وہ دن تو گذر گیا۔ رات کو ایک بیوی نے کہا "اری لڑکی دودھ چولھے پر رکھدے"۔ دوسری بولی "اری ادہر آمیرے بچے کو سُلا دے"۔ ایک وقت میں دو حکم سُنکر مہ جمال ذرا گھبرا گئی۔ اس نے کبھی دودھ چولھے پر رکھا تھا نہ کسی بچے کو لوریاں دیکر سلایا تھا۔ تاہم وہ دودھ اُٹھاکر چولھے پر رکھنے چلی۔ چولھے کے قریب آکر ٹھوکر لگی۔ ہانڈی ہاتھ سے گر پڑی اور ٹوٹ گئی دودھ سب بکھر گیا۔ آواز سنکر نمبردار کی بیوی دوڑ آئی اور دودھ گرا ہوا دیکھکر ایک دوہتھڑ مہ جمال کے ماری اور گالیاں دینی شروع کیں۔

مار کھانے اور گالیاں سُننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ مہ جمال کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی دودھ اس کے کپڑوں پر بھی گرا تھا کبھی وہ کپڑوں کو دیکھتی اور کبھی نمبردار کی بیوی کو دیکھتی جو لگاتار گالیاں بک رہی تھی۔

آخر وہ دیوار کے سہارے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اور بے اختیار رونے لگی مہ جمال کو روتا دیکھکر نمبردار کی بیوی کو پھر غصہ آیا۔ اور اس نے جوتی نکالکر دو تین جوتیاں اسکے چہرہ پر ماریں اور کہا "اب تو مجھ کو روکر ڈراتی ہے۔ موئی ڈائن میواتن کو کھا گئی اب یہاں گھسکو کھانے آئی ہے میرا سارا دودھ پھینکدیا غدار کھے میرے بچوں کو دودھ کا چولھے کے سامنے گرنا برا نحوس ہوتا ہے۔ خبر نہیں تیرا آنا کیا مصیبت لائیگا یہ

مہ جمال کے چہرے پر جوتیاں پڑیں تو وہ بلبلا اُٹھی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپالیا۔ اتنے میں نمبردار آگیا اور اس نے جو یہ شور غل سُنا تو وہ بھی وہاں آیا۔ مہ جمال وہاں سے بھاگ کر اپنی چارپائی کے پاس آگئی نمبردار اور اس کی بیوی بھی دالان میں آئے نمبردار نے بیوی سے پوچھا کیا ہوا تھا۔ اس نے سارا قصہ بیان کیا۔ اس نے کہا چلو خیر جانے دو غریب عورت ہے خطا ہو گئی۔ کچھ خیال نکرو۔ دوسری بولی "یہ غریب نہیں ہے بڑی قطامہ ہے میں نے آواز دی کہ ذرا بچے کو سلادے تو کانوں میں بول مار کر چپ ہو گئی۔ اور سُنی اَن سُنی کر دی۔ اسکو تم بیگم بنا کر لائے ہو یا نوکر بنا کر۔ نوکر ہے تو اسکو کام کرنا پڑیگا"

نمبردار نے کہا "میں تو لاوارث سمجھکر لایا ہوں۔ اس کو کام کرنا چاہیئے۔ ہم کو ایک نوکر عورت کی ضرورت بھی تھی"

مہ جمال نے ڈرتے ڈرتے کہا "مجھکو آج تک نوکری کرنی نہیں آتی تھی۔ تم مجھ کو سکھا دو نقدیر نے یہ وقت تو مجھپر ڈالا مگر نوکری کرنی نہ سکھائی۔ میرے سامنے تو لونڈیاں کام کرتی تھیں میں نے تو کبھی کچھ کام نہیں کیا" یہ کہتے کہتے اسکو ایسا رونا آیا کہ ہچکی بندھ گئی۔

نمبردار نے کہا "لو دوست رفتہ رفتہ سب کام آجائیگا" اس کے بعد کچھ کھانے کو دیا۔ مگر مہ جمال سے کھایا نہ گیا اور وہ یونہی پڑ کر سوگئی۔ صبح کو نمبردار کی بیوی نے زور سے جھنجھوڑا اور کہا اری اُٹھتی نہیں کبتک سوئیگی۔ جھاڑو دینے کا وقت ہے۔

مہ جمال کو یاد آیا کہ دلشاد۔ نرگس۔ سندری کس طرح جگایا کرتی تھیں یا وہ وقت تھا یا یہ وقت ہے۔ ٹھنڈا سانس بھر کر اُٹھی اور حسب عادت دو چار انگڑائیاں لیں۔

نمبردار کی بیوی نے دھکہ دیکر کہا "نحوست پھیلاتی ہے اُٹھتی نہیں۔ اسوقت مہ جمال نے جانا کہ اب میں واقعی لونڈی بنگئی ہوں شہزادی نہیں رہی فوراً اُٹھی۔ مگر آنسو لگاتار دونوں آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ نمبردار کی دوسری بیوی نے کہا "اس عورت کا گزر ہمارے گھر میں نہ ہوگا ہر وقت روتی ہے۔ بال بچوں کے گھر میں اس منحوس کا رکھنا اچھا نہیں"

اتنے میں نمبردار آ گیا۔ اور اُس نے بیوں کے کہنے سے مہ جمال کو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیا۔ مہ جمال حیران پریشان کھڑی تھی اور کہتی تھی۔ یا اللہ۔ کدہر جاؤں اتنے میں اسکو اپنی مالن کا خیال آیا کہ وہ اسی قصبہ میں رہتی تھی اور اماں اسی کے ہاں ٹھیرنیکو گھر سے آئی تھیں مہ جمال یہ خیال کر رہی تھی کہ اتنے میں وہی کفنی والا فقیر سامنے سے آیا اور مہ جمال کو دیکھکر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ مہ جمال پر بھی اس ناگہانی ملاقات کا بہت اثر ہوا اور وہ بھی کچھ گم صم سی ہو گئی۔ اگرچہ وہ ایسی مصیبت کے حال میں تھی کہ اُس کو تن بدن کا ہوش نہ تھا تاہم فقیر اور اُسکی کفنی اور اسکی زرد صورت اور لال آنکھوں کا ایسا اثر اُس پر ہوا کہ تمام بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

فقیر نے کہا "میری ملکہ تم یہاں کہاں؟ مہ جمال نے میری ملکہ کا لفظ سُنا تو لحاظ سے منہ پھیر لیا اور کہا "مجھ کو تقدیر یہاں لے آئی ہے" اور پھر سارا قصہ بیان کیا۔ اُس نے کہا میرا گھر تو قریب ہی ہے مگر میں نے کبھی تمہارا حال نہ سُنا۔ چلئے میرے گھر پر چلیے"

مہ جمال اُس کے پیچھے پیچھے چلی۔ وہ اپنے گھر میں گیا اور مالن سے مہ جمال کا حال کہا وہ دوڑی ہوئی آئی اور مہ جمال کے قدموں میں گر پڑی اور پروانوں کی طرح اُس پر سے صدقے قربان ہونے لگی۔ اس کے بعد بڑی عزت سے چارپائی پر لیجا کر بٹھایا۔ اور حالات پوچھتی رہی۔ اور کہا بیگم یہ گھر آپکا ہے۔ میرا بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ آپ کے گھر کی بدولت خدا نے مالا مال کر رکھا ہے۔ اب آپ اس گھر کی مالک ہیں اور میں اور میرا بیٹا آپ کے لونڈی غلام ہیں۔

مالن نے اپنی حیثیت کے موافق اسقدر آرام مہ جمال کو پہنچایا کہ وہ سب مصیبتوں کو بھول گئی۔ اس نے دیکھا کہ مالن کے لڑکے کے پاس دُور دُور سے بیمار آتے ہیں اور وہ پہلے اپنی کفنی پر ہاتھ ملتا ہے۔ پھر اپنے دونوں رخساروں پر اُنکو رکھتا ہے اور آنکھیں کچھ دیر بند رکھکر پھر کھولدیتا ہے اور کہتا ہے کہ جاؤ تم اچھے ہو۔ سب بیمار آن کی آن میں اچھے ہو جاتے ہیں۔

مہ جمال کئی روز تک یہ تماشا دیکھتی رہی تو اُس نے مالن سے پوچھا "تیرے لڑکے میں یہ طاقت کہاں سے آ گئی۔ اس نے مجکو بھی ایکدن اسی طرح اچھا کر دیا تھا"

مالن نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بیوی جان کی امان پاؤں تو کہوں۔ مہ جمال نے کہا "اب میں جان کی امان دینے کے قابل نہیں ہوں۔ تم کہو مجھے اس بھید کے معلوم کرنیکا شوق ہے"

مالن نے کہا۔ "بیگم میرے لڑکے کو تم سے محبت ہو گئی تھی اور تمہارے فراق میں اس نے بہت دُکھ اُٹھائے۔ آخر ایک فقیر نے اسکو یہ کفنی دی۔ یہ اسی کی برکت ہے جس سے ہزاروں کو فیض پہنچ رہا ہے۔ اور خدا نے گھر بیٹھے تم کو بھی یہاں بھیجدیا۔

مہ جمال پر اس خبر کا بہت اثر ہوا۔ اور کچھ دن کے بعد اس نے مالن سے کہکر قاضی کو بلوایا اور کفنی پوش سے نکاح کر لیا۔

مالن نے تمام عمر مہ جمال کی ایسی خدمت کی اور ایسی محبت سے اُسکو رکھا کہ وہ کہتی تھی۔ کہ "مجھ کو اپنا بچپن بھی یاد نہیں آتا"

مگر مالن کے لڑکے نے کفنی پہننا کبھی ترک نہ کیا۔ اور اس کی کفنی کا فیض دُور دُور مشہور ہو گیا۔ اور اس طرح مہ جمال کی سوتی قسمت کفنی نے جگا دی۔

جب میں شہزادہ تھا

بمبئی کے بھنڈی بازار میں مغل ہوٹل کے برابر ایک بڈھا آدمی بیہوش پڑا تھا آنے جانے والوں نے پہلے خیال کیا کہ کوئی تھکا ہوا مسافر ہے جو اب تک سوتا ہے جو بھنڈی بازار کی ان پٹریوں پر جن پر پیدلوں کا راستہ ہے صبح کے وقت سینکڑوں پردیسی مسافر جن کو مکان میسر نہیں پڑے سویا کرتے ہیں۔ لیکن جب دس بج چکے اور بڈھا بیدار نہ ہوا تو پہرہ والے سپاہی نے قریب آ کر دیکھا۔

بڈھا بہت کمزور اور ناتوان تھا چکی ڈاڑھی ۔ بھوں تک کے بال سفید چہرہ پر جھریاں آنکھیں اندر کو دھسی ہوئیں بدن پر ایک میلا کرتا جس میں کئی پیوند ٹانگوں میں گاڑھے کا پاجامہ سپاہی نے پہلے تو جگانا چاہا اور جب وہ نہ آیا تو قریب آکر غور سے اسکی صورت دیکھی اور بولا۔ یہ تو شاید مرگیا ۔ دو تین راہ گیروں نے جھک کر بڈھے کو کروٹ دی اسکا چہرہ دیکھا تو معلوم ہوا۔ سانس آرہا ہے مگر کسی وجہ سے وہ بیہوش ہے۔

سپاہی نے ایک وکٹوریہ گاڑی والے کو آواز دی اور بڈھے کو اٹھا کر اس میں لادا اور جے جے اسپتال میں لے گیا۔ پارسی ڈاکٹر نے بڈھے کو دیکھکر کہا۔ اسکو کسی نے کچھ کھلا دیا ہے زہر اثر کرچکا اب اس کا علاج مشکل ہے۔ پھر بھی اس نے کوشش شروع کی۔ تھوڑی دیر کے بعد بڈھے کو ہوش آیا۔ اور اس نے کہا بیٹی تو کہاں چلی گئی۔

بڈھے کی آواز اسقدر ناتوان تھی کہ کمپونڈر کے سوا کسی نے نہ سُنی اس لئے اُس نے کہا۔ ارے تو اب اسپتال میں ہے۔ تیری بیٹی یہاں نہیں ہے۔ بڈھے نے پھر مری ہوئی دھیمی آواز میں کہا میں نے سات وقت سے کچھ نہیں کہا یا مجھے کچھ کھانے کو دو۔ میری بیٹی نے کئی دن سے خبر نہیں لی وہ مجکو روٹی کھلایا کرتی تھی۔ خبر نہیں وہ کہاں چلی گئی۔

کمپونڈر نے ڈاکٹر سے یہ حال کہا ڈاکٹر نے شوربا تجویز کیا جو تھوڑا تھوڑا کرکے اسکو پلایا گیا۔

جب بڈھے میں ذرا جان آئی تو پولیس والوں نے اس کے اظہار لئے کیونکہ تھانہ کا محرر اس کی بیہوشی میں ایک پھیرا کرکے چلا گیا تھا جب اس کو خبر ہوئی کہ بڈھے کو ہوش آگیا ہے تو وہ پھر آیا اور اسکے حالات دریافت کئے۔

بڈھے نے کہا میں چار مہینے سے بمبئی میں رہتا ہوں۔ میرا کوئی مکان نہیں ہے سڑکوں پر گذارہ کرلیتا ہوں۔ میری ایک بیٹی بچارنے کی نوکری کرتی ہے۔ وہ کمیت باڑی میں ایک طوائف کے ہاں نوکر تھی اور صبح شام مجکو اپنے حصہ کے کھانے میں سے آدھا کھانا مشر کی

اگر ہو سے جاتی تھی۔ مگر چار دن تھے نہیں آئی جس مکان پر وہ نوکر تھی میں وہاں بھی گیا اور رنڈی سے اس کا حال دریافت کیا۔ اس نے کہا وہ تو دس دن ہوئے ہماری نوکری چھوڑ کے کہیں چلی گئی۔ یہ سنکر میں نے اس کو اور کئی جگہ ڈھونڈا۔ مگر وہ کہیں نہ ملی۔ جب چھ وقت کا فاقہ ہوچکا اور مجھ میں چلنے کی طاقت نہ رہی تو میں بھنڈی بازار کی سڑک پر رات کو لیٹ رہا اور بیہوش ہوگیا۔

تھانہ کے محرر نے پوچھا۔ تم تو بھیک مانگتے تھے پھر کیوں بھوکے رہے۔ بمبئی شہر میں بھیک مانگنے والے بی۔ اے پاس لوگوں سے زیادہ کما لیتے ہیں۔

بڈھے نے محرر کی یہ بات سُنی تو اس کو اسقدر طیش آیا کہ آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑیں اور اس نے اپنی کمزور آواز حلق سے بہت زور کے ساتھ باہر نکال کر کہا۔ بس جناب چپکے رہیئے۔ زیادہ بکواس نہ کیجئے شاید آپ نے اپنے باوا کے ساتھ مجکو بھیک مانگتے دیکھا ہوگا محرر کو ایک شکستہ حال کنگلے کی یہ بات تیر ہوکر لگی اور اس نے بڈھے کے ایک طمانچہ مارا۔ بڈھا طمانچہ کھاکر چیت گر پڑا۔ مگر فوراً اُٹھا اور ڈاکٹر صاحب کا رول میز سے اُٹھاکر محرر کے سر پر مارا جس سے محرر کا سر پھٹ گیا اور وہ غش کھاکر گر پڑا۔ لوگوں نے بڈھے کو پکڑ لیا۔ ورنہ وہ دوسرا وار اور کرنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر نے محرر کو ڈریسنگ روم میں لیجا کر اس کے زخم کو دہویا اور دوا لگائی۔ سپاہی بڈھے کو لیکر تھانہ پہنچا۔ یورپین انسپکٹر وہاں موجود تھا۔ جب اس نے بڈھے کے حالات سنے تو اُس کو بھی بہت غصہ آیا۔ مگر اس نے کہا۔ محرر کے بیان تک اس کو حوالات میں رکھو۔

شور یا پکر بڈھا بہت تیز ہوگیا تھا۔ اور محرر کو برابر بُرا بھلا کہہ رہا تہا۔

زخم پر پٹی باندھے ہوئے محرر تھانہ میں آیا۔ اور انسپکٹر کو واقعات کی رپورٹ سنائی اُس نے بڈھے کو حوالات سے نکالکر پھر اسکے بیانات لکھنے شروع کئے۔

بڈھے نے کہا میں بیان اس وقت دونگا پہلے آپ کے محرر صاحب مجھ سے معافی مانگیں انھوں نے مجھ جیسے عزت دار کو بھیک منگا کیوں کہا۔

محرر نے کہا کیوں بکتا ہے بڑا عزت دار آیا کہیں سے۔ خود تو کہتا تھا کہ میری بیٹی رنڈی کے ہاں نوکر تھی اور اب عزت دار بنتا ہے۔ تو بھیک منگا نہیں ہے تو کوئی ٹھگ یا ڈاکو ضرور ہے۔

بڈھے پر پھر غصّہ کی لہر طاری ہوئی اور قریب تھا کہ وہ محرر پر دوبارہ حملہ کرے۔ لیکن سپاہیوں نے اُس کو پکڑ لیا اور انسپکٹر نے بڈھے کو دھمکایا کہ خبردار اپنی جگہ کھڑے رہو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

بڈھے نے کہا تو کیا آپ ایک شریف آدمی کو گالیاں دلوانے کو یہاں لائے ہیں میں شہنشاہ دہلی کا خون ہوں تو ہرگز کسی کی گالی نہ سنونگا۔ اور اپنی جان اسکی جان ایک کر دونگا۔

شہنشاہ دہلی کے خون کا لفظ سنکر انسپکٹر کو ہنسی آ گئی اور اس نے محرر سے کہا یہ تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ تم اس کو بکنے دو۔

اس کے بعد انسپکٹر نے بڈھے سے سوالات کرنے شروع کیے۔

تمہاری بیٹی کی عمر کتنی ہے۔ بڈھے نے جواب دیا وہ بیس سال کی ہے۔ مگر وہ میری سگی بیٹی نہیں ہے۔ میں نے اس کو پالا ہے۔ میں نے اس کی شادی کر دی تھی۔ مگر اس کا خاوند انفلوئنزا کی وبا میں مر گیا۔ وہ آدم جی پیر بھائی کے کارخانہ میں نوکر تھا۔ میری لڑکی نے بھوپال میں یہ خبر سنی تو وہ اس کو دیکھنے بمبئی آئی میں بھی اس کے ہمراہ آیا۔ یہاں آکر واپسی کا خرچ پاس نہ تھا اس لئے چار مہینے سے ہم بمبئی میں ہیں۔ میری بیٹی نوکری کرتی ہے۔

انسپکٹر نے کہا تم بھوپال میں کیا کام کرتے تھے۔ بڈھا بولا میں ایک امیر کے دروازہ پر چوکیدار تھا۔ میری لڑکی اسی امیر کی چھوکری تھی۔ میں نے اسکو بیٹی بنا لیا تھا۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ شہنشاہ دہلی کا خون تمہارے اندر کے دن سے آیا۔ کیونکہ ابھی تم کہتے تھے کہ میں شہنشاہ دہلی کا خون ہوں۔ ایک ٹکے کا چوکیدار یہ کیونکر دعویٰ کر سکتا ہے۔

بڈھے نے مسکرا کر کہا جب سے تم یہاں آئے میں چوکیدار بن گیا ورنہ تمہارے آنے سے پہلے میں شہزادہ تھا۔ انسپکٹر بڈھے کے مسکرانے سے بگڑا اور اس نے کہا کہ میرے آنے سے پہلے اگر تم شہزادہ تھے تو اتنی جلدی چوکیدار کیونکر بن گئے۔ میرے سامنے پاگل پنے کی باتیں نہ کرو۔ میں تمہاری حقیقت کو جانتا ہوں۔ تم بڑے ہوشیار بدمعاش ہو۔ بڈھے نے یہ بات سُنی تو پھر اُس کے چہرہ کا رنگ بدلا۔ مگر اس نے بہت ضبط کے ساتھ جواب دیا۔ جی ہاں آپ میری حقیقت سے واقف ہیں اور میں آپکی حقیقت سے واقف ہوں۔ میں نے ابراہیم لودی کا گھر لوٹا تھا اس واسطے میں بھی بدمعاش ہوں۔ آپنے میرا گھر لوٹا لہذا آپ بھی بدمعاش ہیں۔ انسپکٹر غصہ سے بیتاب ہوگیا۔ مگر اس نے اپنے مزاج کو قابو میں رکھکر کہا۔ تمہارے گھر میں کتنا سونا چاندی تھا جس کو میں نے لوٹ لیا۔ بڈھے نے جواب دیا جتنا سونا چاندی بابر اور ہمایوں نے ابراہیم لودی کے گھر سے لوٹا تھا وہ سب آپکے قبضہ میں ہے۔

انسپکٹر نے کہا تو کیا تم بابر کی اولاد ہو؟ بڈھا بولا ہاں۔ میں بابر کی اولاد تھا۔ مگر اب چوکیدار ہوں۔ نہیں بلکہ آپ کا قیدی ہوں۔

انسپکٹر نے اس کے بعد کچھ نہ کہا اور حکم دیا۔ اس کو حوالات میں لیجاؤ۔

(۲)

بمبئی میں مغلیہ خاندان کے ایک شہزادہ رہتے تھے۔ گیروا لباس۔ تلوار لگائے ہوئے انگریزی حُکام سے بھی اِن کا ملنا جلنا تھا۔ انسپکٹر نے ان کو بُلایا اور کہا ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ میں دہلی کے شاہی خاندان سے ہوں۔ کیا تم اِس کو پہچان سکتے ہو۔ کیونکہ تم کو بھی دعویٰ ہے کہ میں شہزادہ دارا بخت ابن بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں۔

یہ شخص حوالات کے قریب گیا اور بڈھے چوکیدار کو دیکھکر بولا جھوٹا ہے یہ شہزادہ نہیں ہے۔ حوالات کے اندر سے بڈھے نے کہا نہیں بلکہ تم شہزادہ نہیں ہو۔ انسپکٹر نے پوچھا تم کس دلیل سے

کہتے ہو کہ حوالات والا بڈھا دہلی کے شاہی خاندان سے نہیں ہے۔ وہ بولا بیل کچھ نہیں ہے۔ میں اپنے خاندان کے سب لوگوں کو جانتا ہوں۔

حوالات کے اندر سے بڈھا بولا۔ میں تم سے عمر میں زیادہ ہوں اور اپنے خاندان کا حال تم سے زیادہ معلوم ہے۔ بتاؤ۔ جب بہادر شاہ گرفتار ہو کر رنگون گئے تو ان کے ہمراہ کون کون گیا تھا۔ بمبئی والی شہزادہ نے کہا جواں بخت اور میں اور زینت محل۔ اور بہادر شاہ ایک ٹمٹم میں اور زینت محل دوسری میں جواں بخت اور میں۔ منزل بہ منزل کلکتہ گئے۔ وہاں واجد علیشاہ نے مونبوں کا تھال نذر بھیجا۔ مگر انگریزوں نے اس کو پیش نہ ہونے دیا کلکتہ سے ہم رنگون گئے اور بہادر شاہ کی رحلت کے بعد میں بمبئی چلا آیا۔

حوالاتی بڈھے نے ہنسکر کہا یہی جھوٹ ہے کہ بادشاہ اور زینت محل ٹم ٹم میں تھے دہلی کے بچے بچے کو معلوم ہے کہ یہ دونوں پالکی میں تھے۔ ایک پالکی میں جواں بخت اور زینت محل تھے۔ دوسری میں تاج محل تھیں تیسری میں خود بادشاہ تھے۔ ان کے سوا کوئی شخص ان کے ہمراہ نہ تھا۔

بمبئی والا شہزادہ کچھ گھبرا سا گیا۔ کیونکہ اس نے فرضی داستان اپنے شہزادہ ہونے کی بمبئی میں مشہور کر رکھی تھی۔ اور لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔

بڈھے حوالاتی نے اور بھی چند سوالات کئے مگر کسی کا ٹھیک جواب بمبئی والے شہزادہ نے نہ دیا۔

انسپکٹر کھڑا ہوا باتیں سن رہا تھا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ حوالاتی بڈھا سچا ہے اس لئے اس نے اس کو حوالات سے نکال لیا اور سامنے کرسی پر بٹھا کر حالات دریافت کرنے لگا کہ غدر سے اب تک اس پر کیا کیا گذری۔

(۳)

حوالاتی بڈھے نے کہا میں میرزا خضر سلطان کا بیٹا ہوں جو بہادر شاہ کے بیٹے تھے اور جن کو غدر کے بعد گولی سے قتل کر دیا گیا۔ غدر میں میری عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ غدر کے

زمانہ میں مجکو پیچش ہو رہی تھی۔ چار مہینے لگاتار بیمار رہا جس دن میرے والد گرفتار ہوئے میں ہمایوں کے مقبرہ میں تھا۔ شام کو جب خبر آئی کہ میرزا مغل اور میرزا خضر سلطان وغیرہ قتل کردیئے گئے۔ تو میری والدہ مجکو اور میری چھوٹی بہن کو لیکر فریدآباد کیطرف روانہ ہوئیں کیونکہ وہاں ہمارے دو نوکروں کا گھر تھا۔

جب ہماری بیل گاڑی بدرپور پہنچی تو میجر ہڈسن اور میرزا الٰہی بخش نے سوار لاکر ہمکو گھیر لیا گاڑی کی تلاشی لی اور مجکو گرفتار کرلیا۔ میری صورت مُردوں کی ہو رہی تھی۔ خون کے دست آتے تھے۔ والدہ نے رو رو کر کہا یہ بہت بیمار ہے اس کا کچھ قصور نہیں ہے۔ یہ تو چار مہینے سے گھر میں پڑا ہوا ہے۔ ہڈسن صاحب نے کہا اگر اس کے باپ نے انگریزوں کے بچوں اور عورتوں کو قتل کرایا تھا ہم اس کو قید کرکے تحقیقات کرینگے اگر یہ بیگناہ ہوا تو چھوڑ دیں گے ورنہ اس کو قتل کیا جائیگا۔ میری بہن مجھ سے بہت مانوس تھی اسنے مجکو گرفتار دیکھا تو روتی ہوئی دوڑی اور مجھ کو چمٹ گئی صاحب نے اس کو زبردستی ہٹا دیا اور مجکو ایک سوار کے پیچھے بیٹھا کر دہلی کے کیمپ میں لے آئے۔

میں والدہ اور بہن سے جدا ہوا تو وہ دونوں زار و قطار کھڑی روتی تھیں والدہ نے روتے روتے اتنا کہا۔ بیٹا جان سے بچ گئے تو جلدی صورت دکھانا جاؤ اللہ بیلی اللہ نگہبان۔

تحقیقات کے زمانہ میں مجھ کو سمندر خاں پنجابی سپاہی کے پاس رکھا گیا تھا جو بڑا ظالم شخص تھا میں پیچش کے سبب گھڑی گھڑی پاخانہ جاتا تھا۔ جب میں فارغ ہو کر آتا تو وہ کہتا جاؤ اسکو اپنے ہاتھ سے صاف کرو۔ پہلی دفعہ میں نے انکار کیا تو اس نے دو تین طمانچے میرے مارے کمزوری کے سبب مجکو غش آگیا اور تمام رات بخار بھی چڑھا رہا۔ اسی حالت میں پاخانہ جاتا تھا۔ چکر آتے تھے گر گر پڑتا تھا۔ مگر مجبوراً پاخانہ کو ہر دفعہ صاف کرکے باہر ڈالنے جاتا تھا ایکدفعہ میں نے کہا مجکو جنگل میں جانیکی اجازت دیجئے تاکہ صاف کرنے کی تکلیف سے بچ جاؤں تو اس ظالم نے کہا شاید بھاگنے کا ارادہ ہوگا۔ تم جنگل میں نہیں جا سکتے۔

کھانے کو بھی بہت خراب غذا ملتی تھی جس سے پیچش بڑھ گئی تھی چار دن کے بعد مجکو بڑے انگریز کے سامنے پیش کیا گیا۔ گامی خاں مخبر کی گواہی ہوئی۔ جس نے بیان کیا کہ یہ لڑکا اپنے باپ میرزا حضر سلطان کے ساتھ پہاڑی پر لڑنے جاتا تھا۔ اور لال قلعہ میں جو انگریزوں کے بچے اور عورتیں قتل کئے گئے اس وقت بھی یہ موجود تھا۔ اور اسی نے زنانہ محل سے باہر آکر کہا تھا کہ بادشاہ نے اِن لوگوں کے قتل کا حکم دیدیا ہے۔

بڑے صاحب نے یہ گواہی سُنکر میری پھانسی کا حکم دیا۔ میں نے کہا اس گواہ سے تو یہ پوچھئے کہ پہاڑی پر باغی فوج کے ساتھ جاتے ہوئے یا لال قلعہ میں زنانہ محل سے باہر آتے ہوئے اس نے خود مجکو دیکھا تھا یا سُنی سُنائی کہتا ہے۔

گامی خاں نے کہا میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا جب فریزر ڈگلس صاحب قلعہ دار مارے گئے ہیں تم کہاں تھے۔ گامی خاں کا چہرہ فق ہو گیا۔ اور اس نے گردن جھکالی اور کچھ دیر کے بعد کہا میں اس روز اپنے گھر میں تھا۔ میں نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو تم خود وہاں باغیوں کے ساتھ موجود تھے اور تم ہی نے باغیوں کو ڈگلس صاحب کے قتل پر اُبھارا تھا میں اُس وقت وہاں موجود تھا۔ کیونکہ والدہ نے پیچش کے علاج کے لئے ڈگلس صاحب کے مہمان ڈاکٹر صاحب کے پاس مجکو بھیجا تھا۔ تم نے صاحب و میم صاحب و مہمانوں کے قتل کے بعد چاندی کا ایک گلدان اُٹھا لیا تھا۔ اور صاحب کی گھڑی بھی تم نے لی تھی۔ گامی خاں نے کہا جھوٹ ہو میں وہاں نہیں تھا۔ مگر اس کے چہرہ پر ایسی گھبراہٹ تھی کہ بڑے صاحب کو شبہ ہوا اور اُنھوں نے حکم دیا کہ گامی خاں کے گھر کی تلاشی لیجائے۔ چنانچہ اسی وقت فوج بھیجی گئی اور کچھ دیر کے بعد گھڑی اور گلدان لئے ہوئے سپاہی واپس آئے۔ اور اسکے علاوہ ہزار ہا روپیہ کا اور بھی قیمتی سامان اس کے گھر میں سے نکلا۔

صاحب نے یہ دیکھکر گامی کو پھانسی کا حکم دیا۔ اور مجکو رہا کر دیا۔ قید سے چھوٹ کر میں فریدآباد آیا۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ والدہ اور بہن یہاں نہیں آئیں ہر جگہ تلاش کیا لیکن

کچھ پتہ نہ چلا۔ چند روز فریدآباد میں ٹھیرا جب تندرستی ٹھیک ہوگئی تو منزل بمنزل پیدل چلکر بھوپال آیا۔ کیونکہ یہاں میرے والد کے دوستوں میں ایک امیر رہتے تھے۔ بھوپال پہنچکر معلوم ہوا کہ اس امیر کا انتقال ہوگیا۔ انکے وارثوں نے بہت بے توجہی برتی۔ آخر میں ایک دوسرے امیر کے ہاں چوکیدار و میں نوکر ہوگیا اور تمام زندگی اسی جگہ گذار دی۔

انسپکٹر پولیس نے یہ بیان سُنکر محرر سے کہا بیشک یہ عزت دار آدمی ہے تم اس سے معافی مانگو اسکے بعد حکم دیا کہ اسکی بیٹی کو تلاش کیا جائے۔ اور جب تک اسکا حال معلوم ہو اسکے کھانے کا خرچ میں دونگا۔ چار دن کے بعد معلوم ہوا کہ کسی بدمعاش نے اس کی لڑکی کو پکڑ کر کہیں چھپادیا اور وہ اس سے بازاری پیشہ کرانا چاہتا تھا۔ مخبروں نے سُراغ نکال لیا بدمعاش کو سزا ہوئی اور شہزادہ لڑکی کو لیکر انسپکٹر کے خرچ سے بھوپال چلا آیا۔

چلتے وقت شہزادہ نے انسپکٹر کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا بُرا نہ ماننے گا میں نے سچ کہا تھا کہ جب بابر و ہمایوں نے ہندوستان فتح کیا تو وہ ڈاکو تھے اور آپ ہیں۔ آج آپ شہزادہ ہیں اور جب میں شہزادہ تھا۔

جدید اضافہ

الحمدللہ غدر دہلی کے افسانوں کا یہ چھٹا ایڈیشن شایع ہوتا ہے اسمیں سے وہ مضامین جنکا تعلق خاص حالات غدر سے نہ تھا بلکہ صرف شاہی خاندان کی تباہی کا ذکر ان میں تھا نکال دئے گئے۔ ان مضامین کو سی پارۂ دل حصہ دوم میں درج کیا جائے گا۔

ان مضامین کیجگہ نئے قصے کفنی وغیرہ بڑھا دئے گئے جو خارج شدہ مضامین سے صفحات میں کچھ زیادہ ہیں۔ اور باوجود اس مزید اضافہ کے قیمت نہیں بڑھائی گئی۔

حسن نظامی

Hassan Nizami

۴ نومبر ۱۹۲۲ء